ALTERNATE SOLUTIONS INSTITUTE

ایک آزاد اور ذمہ دار معاشرے کی بنیادیں

ایمن بٹلر

(اردو ترجمہ)

آزاد منڈی- آزاد معیشیت- مضبوط ملکیتی حقوق- آزاد تجارت
مسابقتی نجی خدمات - کم ٹیکس - قانون کی حکمرانی

ایک آزاد اور ذمے دار معاشرے کی بنیادیں

ایمن بٹلر

(اُردو ترجمہ)

ایک آزاد اور ذمے دار
معاشرے کی بنیادیں

مصنف: ایمن بٹلر

(اُردو ترجمہ)

ALTERNATE SOLUTIONS INSTITUTE

الٹرنیٹ سلوشنز انسٹیٹیوٹ، پاکستان

حقوق ترجمہ بحق ادارہ محفوظ ہیں

کتاب	:	ایک آزاد اور ذمے دار معاشرے کی بنیادیں
مصنف	:	ایمن بٹلر
ترجمہ	:	ادارہ
صفحات	:	180
قیمت	:	320 روپے
اشاعت	:	اکتوبر 2020ء
تعداد	:	1000
مطبع	:	العطاء پرنٹنگ پریس، پشاور
ISBN	:	978-969-8777-15-9

ادارے یا ادارے سے متعلق کسی فرد کا مصنف یا ترجمے کی آراء یا مفہوم سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

الٹرنیٹ سلوشنز انسٹی ٹیوٹ، پاکستان

Website: asinstitute.org | Email: info@asinstitute.org

مختصر تعارف

زیرِ نظر کتاب ایمن بٹلر کی انگریزی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے۔ کتاب کا مقصد ایک آزاد اور ذمہ دار معاشرے کی معاشی وسماجی بنیادوں کی وضاحت کرنا ہے۔ الٹرنیٹ سلوشنز انسٹیٹیوٹ پاکستان میں معاشی آزادی، غربت میں کمی اور کاروباری آسانیاں پیدا کرنے کیلئے کوشاں ہے۔ ادارے نے کتاب کے ترجمہ میں پاکستانی معاشرے کے لحاظ سے ترامیم کی ہیں تاکہ پاکستانی قارئین ملکی معاشی مسائل کے حل میں کتاب سے مستفید ہوسکیں۔ مزید یہ سمجھا جائے کہ ایک آزاد معیشت معاشرے میں قانونی، کاروباری، سماجی اور اخلاقی لحاظ سے کتنی اہم ہیں۔ اگرچہ آزادی کے تصور کے اہم شخصی، سماجی، سیاسی اور معاشی مضمرات ہوسکتے ہیں لیکن اس کتاب کا بنیادی نکتہ معاشی آزادی ہے۔ پاکستان جیسے روایت پسند معاشرے میں سماجی اور شخصی آزادی مغربی معاشرے سے مختلف ہوسکتی ہے لیکن بنیادی اہمیت ایک ذمہ دار اور پُرامن معاشرے کا قیام ہے جہاں ہر فرد اور ہر طبقہ حکومتی اور غیر حکومتی استحصال سے مبرا ہو اور ہر شخص اپنے حق کو محفوظ سمجھتا ہو۔

مصنف کے خیال میں کسی بھی معاشرے میں بیشتر خامیاں معاشی بندشوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور معاشرے پر ان کے دورس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ٹیکس نظام کی بہتری بہت ضروری ہے کیونکہ ٹیکسوں کی زیادتی اور پیچیدگی کاروباری سرگرمیوں پر منفی طور پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یعنی کاروبار پسند معاشرے کے بنیادی خدوخال معاشی آزادی کے مرہونِ منت ہوتے ہیں اور اس طرح نتیجتاً دولت کی وافر تخلیق اور پھر مارکیٹ کے ذریعے اس کی تقسیم معاشرے میں خوشحالی

خوشحالی کوجنم دیتی ہے۔سرمایہ دارانہ نظام اورکرونی کیپٹلزم دونوں مختلف چیزیں ہیں۔کرونی کیپٹلزم سیاست دانوں اور پیدا کاروں کے باہمی گٹ جوڑ سے جنم لیتا ہےاور آزاد کاروبار پر بندشیں عائد کرتا ہے تا کہ کچھ مخصوص گروہ مارکیٹ پر قابض ہوکرزیادہ سے زیادہ منافع نکال سکیں اوراس طرح عام شہری کیلئے لاتعداد مسائل پیدا ہوتے ہیں۔یہ کتاب اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ غریب عوام کا معاشی استحصال سرمایہ دارانہ نظام نہیں بلکہ کرونی کیپٹلزم کرتا ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ حکومتی دائرے کار اتنی نہ پھیل جائے کہ عوام کی زندگی اور انکی روزمرہ سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے لگیں اور انکے لئے کاروباری سرگرمیاں جاری رکھنا مشکل ہوجائیں۔لہذا معاشی آزادی ایک ایسے بندوبست کا نام ہے جس میں حکومتیں اپنے اصل کام پر توجہ دیتی ہیں۔یعنی لوگوں کے کاروبار، انکی ملکیت اور دولت کا تحفظ اور خصوصاً انصاف کی فراہمی۔ جبکہ دولت کی تخلیق اور تقسیم لوگ خود مارکیٹ کے ذریعے کرتے ہیں۔اسی طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حکومت کا اصل کام امن وامان اورقانون کی حکمرانی قائم کرنا ہے مارکیٹ میں مداخلت کرنا نہیں۔

ڈاکٹر رضا اللہ

اعزازی صدر

الٹرنیٹ سلوشنز انسٹیٹیوٹ پاکستان

۳۱ اگست ۲۰۲۰ء

خلاصہ

☆ آزادی، خوشحالی کو جنم دیتی ہے۔ یہ انسانی ذہانت، ایجاد اور اختراع کو بندشوں سے آزاد کرتی ہے، اور یوں وہاں دولت تخلیق کرتی ہے، جہاں یہ پہلے موجود نہیں تھی۔ ایسے معاشرے جنھوں نے آزادی کو قبول کر لیا ہے، انھوں نے خود کو امیر بنا لیا ہے۔ جنھوں نے ایسا نہیں کیا، وہ غریب رہ گئے۔

☆ آزاد معاشرے میں لوگ ایک دوسرے کے استحصال سے امیر نہیں بنتے، جیسا کہ کم آزاد ملکوں میں اشرافی طبقات کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کو غریب تر کر کے امیر نہیں بن سکتے۔ وہ صرف اس صورت میں امیر بنتے ہیں، جب وہ دوسروں کو وہ کچھ مہیا کریں، جو وہ چاہتے ہیں، اور وہ دوسرے لوگوں کی زندگیوں کو بہتر بنا کے امیر بنتے ہیں۔

☆ آزاد معاشروں کی معاشی سرگرمی سے جنھیں سب سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے، وہ غریب ہیں۔ آزاد معاشرے، غیر آزاد معاشروں کی نسبت زیادہ برابری کے حامل ہوتے ہیں۔ زیادہ آزاد معاشروں میں غریب ان تعیّشات سے لطف اندوز ہوتے ہیں، محض چند برس پہلے جن کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا، اور جو غیر آزاد معاشروں میں صرف حاکم اشرافیہ کو دستیاب ہوتی تھیں۔

☆ بین الاقوامی تجارت، کاروباریوں کو نئے بازار کے مواقع مہیا کرتی ہے اور گذشتہ بیس برسوں میں اس نے ایک ارب سے زیادہ لوگوں کو بدترین غربت سے باہر نکالنے میں مدد دی ہے۔ آزادی، انسانی تاریخ میں ایک نہایت معاون اور پیداآور قوت رہی ہے۔

☆ دولت یا آمدنی کو مساوی بنانے کی حکومتوں کی کوششیں مخالف نتائج پیدا کرتی ہیں۔ یہ سخت محنت اور کاروبار کی ترغیب کو تباہ کرتی ہیں، اور لوگوں کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں کہ وہ سرمائے کی تعمیر نہ کریں، جو پورے معاشرے کی پیداواریت کو بڑھاتا ہے۔

☆ آزاد معاشرہ ایک خودرو معاشرہ ہوتا ہے۔ یہ افراد کے اعمال سے تعمیر ہوتا ہے، جو ایسے قواعد کی پیروی کرتے ہیں، جو پرامن تعاون کو فروغ دیتا ہے۔ یہ اوپر سے سیاسی حکام کی طرف سے مسلط نہیں ہوتا۔

☆ آزاد معاشرے میں حکومت کا کردار بہت محدود ہوتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ انصاف کی دستیابی کے ذریعے اپنے شہریوں کو نقصان نہ پہنچنے دے۔ یہ مادی مساوات مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتی اور سرگرمیوں اس لیے ممنوع قرار نہیں دیتی کہ محض چند لوگ انھیں غیر مناسب یا ناپسندیدہ سمجھتے ہیں۔ سیاسی لیڈر خود اپنے فائدے کی خاطر شہریوں کو لوٹ نہیں سکتے، اپنے دوستوں پر عنایات نہیں کر سکتے، یا اپنے اختیارات کو اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال نہیں کر سکتے۔

☆ آزاد معاشرے کی حکومت کو قانون کی حاکمیت اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ تمام مقدمات میں قانون کا ضروری عمل پورا ہونا چاہیے، مقدمہ منصفانہ انداز میں چلنا چاہیے، اور مقدمے کے بغیر طویل قید نہیں ہونی چاہیے۔ جرائم کے ملزمان کو، جب تک وہ مجرم قرار نہ پا جائیں، معصوم سمجھا جانا چاہیے اور ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہونا چاہیے، اور بار بار ایک ہی جرم میں افراد پر مقدمہ چلا کر انھیں ہراساں نہیں کیا جانا چاہیے۔

☆ دوسرے افراد کے خیالات اور طرز ہائے حیات کے ضمن میں رواداری سے معاشرے کو فائدہ ہوتا ہے۔ صداقت ہمیشہ عیاں نہیں ہوتی، یہ خیالات کی جنگ سے سامنے آتی ہے۔ ہم سینسر (بندش) والوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے کہ یہ غلط خیالات کو دبائیں گے۔ یہ غلطی سے ایسے خیالات اور طرز ہائے انداز کو بھی دبا سکتے ہیں، جو مستقبل میں معاشرے کو بہت فائدہ پہنچانے

والے ہوں۔

☆ روابط کی ٹیکنالوجی، جابر اور استبدادی حکومتوں کے لیے اس بات کو مشکل بنا رہی ہے کہ وہ اپنے اقدامات کو باقی دنیا سے چھپا سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ملک خود کو تجارت اور سیاحت کے لیے کھول رہے ہیں، اور یوں نئے خیالات پھیل رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگ معاشی اور سماجی آزادی کے فائدوں کو دیکھ رہے ہیں، اور ان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

فہرستِ مضامین

مختصر تعارف v

خلاصہ vii

پہلا باب: تعارف: آزاد اور ذمے دار معاشرے کی تعمیر

کتاب کا مقصد 1

کتاب کی ترتیب 2

دوسرا باب: آزادی کے اخلاقی اور معاشی فوائد

ایک آزاد معاشرہ 5

- آزادی کا کیا مطلب ہے 5
- آزادی اور حکومت کا کردار 7
- آزادی کے اخلاقی فوائد 10
- آزادی کی روحانی اور ثقافتی جڑیں 10
- بھروسے اور باہمی تعاون کی ثقافت 11
- ذاتی مفاد اور ضابطے 12
- متفقہ ضابطوں کے ذریعے تعاون 15
- انصاف اور قانون کی حاکمیت 16

آزادی کے معاشی فوائد 18

- معیارِ زندگی میں ازحد اضافہ 18
- آزادی اور فیاضی 19
- آزادی امتیاز پسندی کو مٹاتی ہے 20
- آزاد لوگوں کی تخلیق پسندی 21
- سرمائے کی تخلیق 22
- جائیداد اور ترقی 24
- دولت تخلیق کرنا کسی کی قیمت پر نہیں 25
- ایک آزاد معاشرہ کرونی کیپٹلزم نہیں ہوتا 26

آزادی کی فتح 29

تیسرا باب: آزاد معاشرے کے ادارے

ریاست کے بغیر معاشرہ 31
- آزادی اور ثقافت 32
- حکومت کی ضرورت کن لوگوں کو ہے؟ 33

حکومتیں محدود کیوں ہونی چاہییں؟ 34
- حکومتوں کو کیا کرنا چاہیے؟ 34
- حکومت کی ضرورت ہی کیوں ہے؟ 36
- شخصی اور معاشی آزادی پر رائے 37
- انفرادی انتخاب کی آزادی کیوں ہونی چاہیے؟ 39
- تنوع ترقی کو بڑھاتا ہے 40
- مداخلت کے نقصان دہ اثرات 42
- چند لوگوں کا فیصلہ 44

• پدرانہ دلیل 45

حکومت کو محدود کرنے کے طریقے 47

• جمہوریت 47

• سرکاری فیصلہ سازی 48

• ووٹروں کا ذاتی مفاد 50

• سیاست دانوں کا ذاتی مفاد 51

• مفاداتی گروہ اور سودے بازی 51

• قاعدوں کی تشکیل 52

• آئینی پابندیاں 53

• مجبور لوگ 55

چوتھا باب: برابری اور نابرابری

آزاد معاشرے میں نابرابری 57

• نابرابری کی قسمیں 58

• اخلاقی برابری 59

• قانون کی نظر میں برابری 59

• سیاسی برابری 60

• موقعے کی برابری 62

• مثبت امتیاز 64

• منفی امتیاز 65

• نتائج کی برابری 66

• آمدنی کی برابری کے اعداد وشمار 66

- آمدنی کی برابری یا دولت کی برابری 67
- دوبارہ تقسیم کی میکانکیت 70

برابری اور انصاف 71

- انصاف کے دو مفہوم 71
- معاشرے کے لئے قابلِ قدر ہونا 72
- قابلیت کے حساب سے تقسیم 73
- ضرورت کے مطابق تقسیم 74

مساوات پسندی کے مزید نقصانات 76

- مادی خواہشیں باقی رہتی ہیں 76
- امیروں کا کردار 77
- سرمائے کی تباہی 78
- ٹیکس اور فلاح 79

پانچواں باب: آزاد کاروبار اور تجارت

آزاد منڈی کی معیشت 81

- تعاون کو بڑھانے کے قاعدے 81
- رضا کارانہ تبادلے کے فائدے 82
- تجارت قدر کیسے پیدا کرتی ہے؟ 83
- سب سے زیادہ فائدہ غریبوں کو ہوتا ہے 84

دولت مند کیسے بنا جائے 85

- پیدا کاروں کو گاہکوں کا خدمت گزار بننا ہوگا 85
- معاشی طاقت پر کوئی پابندی نہیں 86

- نفع اور سٹہ 89
- کاروبار اور تعلقات 91

مارکیٹ کیسے کام کرتی ہے؟ 92

- قیمتوں کا بین الروابطی نظام 92
- مارکیٹ غلطی سے بری نہیں ہو سکتی 93
- مرکزی منصوبہ بندی ناممکن ہے 94
- ریاست کی سرپرستی میں کاروبار 96

بین الاقوامی تجارت 98

- تجارت بمقابلہ تحفظ پرستی 98
- تحفظ پرستی فضول خرچی ہے 100
- آزاد تجارت عمل میں 101

چھٹا باب: ملکیت اور انصاف

نجی ملکیت 103

- ملکیت کا مفہوم 103
- ملکیت اور ترقی 104
- ملکیت اور دوسرے حقوق 106
- ملکیت کے اخلاقی فائدے 106
- معاشرے کے ساتھ مفاد کی وابستگی 107

انصاف کے قاعدے 108

- انصاف کا حصول 108
- انصاف، قانون، اخلاقیات یا برابری نہیں 110

- انصاف کا نفاذ 111
- انصاف کو لاحق خطرات 111
- فطری انصاف 113

قانون کی حکومت 115

- قانون کی حکومت کا مطلب 115
- قانون کی حکومت کی حفاظت 116
- انصاف کا نظم ونسق 117
- انصاف اور معاشی ترقی 119
- قانون کی حکومت کو لاحق خطرات 119

انسانی حقوق 120

- انسانی حقوق کی تعریف 120
- آزادیاں، حقوق اور فرائض 121

ساتواں باب: خودرو معاشرہ

نظام جس میں کوئی حکم نہیں چلاتا 125

- معاشرے، قاعدے جن کی رہنمائی کرتے ہیں 126
- بکھرا ہوا علم اور طاقت 127

برداشت اور رواداری 129

- برداشت کا مفہوم 129
- برداشت، مختلف ہونا اور انتخاب 130
- سیاسی درشتگی 131
- برداشت اور سچائی کی تلاش 132

- عوامی اور نجی طرزِ عمل 134
- ایثار پسندی کا مسئلہ 136
- دوسروں کی مدد کیلئے کوئی گائیڈ موجود نہیں 136
- ایثار پسندی تنازعے کو جنم دیتی ہے 137
- ذاتی مفاد اور لاگت-فائدہ 137
- مارکیٹ کی اخلاقیات 139
- کارپوریٹ سوشل رسپانسبیلیٹی (کاروباری سماجی ذمے داری) 140

آٹھواں باب: نج کاری اور عالم گیریت

ہجرت اور ٹیکنالوجی 143
- ایک کھلتی ہوئی دنیا 143
- خیالات کا تبادلہ 144

ایک آزاد معاشرے کی نشوونما 144
- اوپر سے نیچے کی سرمایہ پسندی نہیں 144

ملکیتی حقوق عمل میں 146
- پیرو میں ملکیتی حقوق 146
- اصلاحات کی حمایت 148
- زرعی اصلاحات 149
- پانی کے حقوق 151
- نجکاری کی میکانکیت 151
- مارکیٹ کے اصولوں کو متعارف کروانا 153
- اسے درست کیسے کیا جائے؟ 154

حکومت کے بغیر انسانی خدمات 154

- حکومت کے بغیر تعلیم 155
- حکومت کے بغیر حفظانِ صحت 157
- حکومت کے بغیر بہبود 159
- فلاحی شعبے کا احیا 161

عالم گیریت اور تجارت 163

- عالمگیریت کے فائدے 163
- نیوزی لینڈ کا کھولا جانا 164
- ثقافتی پہچان 164

امن کی اہمیت 167

نواں باب: دلیل مختصر طور پر

آزادی کا مقدمہ 171

محدود حکومت 172

زیادہ برابری 172

ایک آزاد معیشت 173

انصاف اور قانون کی حاکمیت 174

آزادی کی دنیا 175

منتخب کتابیات 177

تبصرہ 179

پہلا باب: تعارف
آزاد اور ذمے دار معاشرے کی تعمیر

کتاب کا مقصد

یہ کتاب ان بنیادی اصولوں کو بیان کرتی ہے، جو ایک آزاد معاشرے کا تعین کرتے ہیں۔ اس کی ضرورت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل شخصی، سماجی، سیاسی اور معاشی آزادی اس قدر نایاب ہے، حتیٰ کہ ان ملکوں میں بھی جو خود کو آزاد سمجھتے ہیں۔ یقیناً زیادہ آزاد اور کم آزاد ملکوں کے درمیان بڑے اختلافات موجود ہیں، پھر بھی ہر ملک میں، زیادہ یا کم حد تک، لوگوں کی سماجی اور معاشی زندگیوں پر حکام یا سیاست دانوں نے بندشیں اور پابندیاں عائد کی ہوئی ہیں۔ یہ بندشیں اور پابندیاں خاصے عرصے سے موجود ہیں، اور ثقافت کا حصہ بن چکی ہیں۔ لوگ انھیں بس اپنی زندگی کا حصہ سمجھتے ہیں، فطری اور ناگزیر حصہ۔

نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی بیشتر آبادی، خواہ وہ یہ سمجھ رہی ہو کہ وہ آزاد معاشرے میں زندہ ہے، مشکل ہی سے اس بات سے واقف ہوگی کہ حقیقی آزادی کا کیا مطلب ہوتا ہے، اور اسے اس کا اندازہ تو بہت کم ہوگا کہ ایک آزاد معاشرہ کیسا ہوگا اور وہ کیسے کام کرے گا۔

تاہم، زیادہ تر لوگ آزادی چاہتے ہیں۔ وہ لاتعداد اجازت نامے حاصل کیے بغیر تجارت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے گھروں، فارموں اور ورکشاپوں میں تحفظ و سلامتی چاہتے ہیں، بجائے اس کے کہ کہیں سیاست دان انھیں اٹھا کر باہر نہ پھینک دیں اور ان کی زندگیاں تباہ کر دیں۔ وہ خود یہ فیصلہ کرنا چاہتے ہیں، ان کے گھرانوں کے لیے کیا بہترین ہے، بجائے اس کے کہ

حکام انھیں ہدایات دیں۔ وہ پولیس کو رشوت دیے بغیر اپنی زندگیاں گزارنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں افسر شاہی انھیں تنہا چھوڑ دے۔

یہی سبب ہے کہ سماجی اور معاشی آزادی کے بنیادی اصولوں کو بیان کرنا اس قدر اہم ہے۔ آزادی کیا ہے، اور یہ کیسے کام کرتی ہے، اس کا صاف تصور ہی وہ بنیاد ہے جس پر لوگ حقیقی طور پر ایک آزاد معاشرے کو تعمیر کر سکتے ہیں۔

کتاب کی ترتیب

دوسرا باب نہ صرف یہ واضح کرتا ہے کہ آزاد معاشرے کے معاشی فائدے کیا ہیں، بلکہ آزادی کے حق میں اخلاقی دلیل بھی مہیا کرتا ہے۔ ایک آزاد معیشت اور ایک آزاد معاشرہ، اقدار پر مبنی ہوتے ہیں، ایسی اقدار نہیں، جو دوسرے اخلاقی نظاموں کو چیلنج کریں، بلکہ ایسی اقدار، جو انھیں سہارا دیں، اور انھیں تقویت واستحکام دیں۔ آزادی سب کے لیے ہے۔

تیسرا باب یہ واضح کرتا ہے کہ ایک آزاد معاشرہ لوگوں کی ضروریات کو ہموار اور تیز تر طریقے سے کیسے پورا کرتا ہے، اور یہاں طاقت ور حاکموں کی ضرورت نہیں پڑتی، جو لوگوں کو یہ بتائیں کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ درحقیقت، یہ بتاتا ہے کہ حکومت کو اپنے دائرۂ کار اور دائرۂ اختیار میں محدود کیوں ہونا چاہیے، اور یہ دکھاتا ہے کہ آزاد معاشرہ کیسا ہونا چاہیے اور اسے کیسے کام کرنا چاہیے۔

چوتھا باب، آزادی اور مساوات کے درمیان ظاہری تنازعے سے بحث کرتا ہے۔ یہ دلیل دیتا ہے کہ زیادہ آزادی دراصل ہر اہم معاملے میں زیادہ برابری کو جنم دیتی ہے۔ لیکن معاشرے پر نتائج کی مساوات کو مسلط کرنے کی کوششیں آزادی کے اصولوں کو نقصان پہنچاتی ہیں اور طویل مدتی نقصان بھی۔

پانچواں باب، آزاد معاشرے کے ڈھانچے کا ایک خاکہ بیان کرتا ہے، یہ واضح کرتے ہوئے کہ جب بازار، ریاست کے کنٹرول سے آزاد ہوتا ہے، تو یہ کس طرح خوشحالی کو تخلیق بھی کرتا

اور پھیلاتا بھی ہے۔ یہ ان قاعدوں کی وضاحت کرتا ہے، جن کی پیروی کرتے ہوئے ہم اس عمل کو ہموار طریقے سے جاری رکھتے ہیں، اور انسانی تعاون کے فروغ میں آزاد تجارت کے نہایت اہم کردار کو بھی واضح کرتا ہے۔

چھٹا باب، ملکیت اور انصاف کے اصولوں کا جائزہ لیتا ہے۔ یہ کھول کر بیان کرتا ہے کہ آزاد معاشرے کے قوانین کے لیے عمومی ہونا کیوں لازم ہے، اور یہ کہ ان کا نفاذ با اختیار لوگوں اور عام شہریوں پر ایک جیسا ہونا چاہیے۔ یہی صورت ہے جس کی مدد سے جبر واستحصال کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ واضح کرتا ہے کہ آزاد معاشرہ، بنیادی انسانی حقوق کا احترام کیسے کرتا ہے۔

ساتواں باب، زیادہ تفصیل سے یہ وضاحت کرتا ہے کہ ایک آزاد معاشرہ کیسے کام کرتا ہے، اور یہ کہ اسے با اختیار لوگوں کے احکامات کی ضرورت کیوں نہیں ہوتی ۔ یہ بنیادی اخلاقی قاعدوں اور طرزِ عمل سے متعلق قاعدوں کو بیان کرتا ہے، جو ایک کارگر مگر آزاد سماجی نظم کو قائم کرتے ہیں۔ یہ رواداری کی ضرورت پر زور دیتا ہے، اور معاشرے کو ایثار پسندی پر تعمیر کرنے سے متعلق مسائل کو واضح کرتا ہے۔

آٹھواں باب، اس بات پر توجہ دیتا ہے کہ ایک آزاد معاشرے کی تعمیر کیسے کی جائے، جبکہ کوئی ایسا معاشرہ موجود نہیں۔ یہ روزمرہ زندگی میں ترغیبات کو بہتر بنانے کی اہمیت، اور اوپر سے فیصلوں کو مسلط کرنے کی حماقت کو کھول کر بیان کرتا ہے۔ یہ دکھاتا ہے کہ حکومت کے بغیر نہایت اہم خدمات کیسے فراہم کی جا سکتی ہیں۔ اور یہ آزاد تجارت اور امن کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔

دوسرا باب
آزادی کے اخلاقی اور معاشی فوائد

ایک آزاد معاشرہ

آزادی کا کیا مطلب ہے؟

آزادی یا حریت کا سادہ مطلب ہے قید میں نہ ہونا یا غلام نہ ہونا۔ اس کا مطلب ہے جیسے آپ کی مرضی ہو اس طرح عمل کرنے، بات کرنے اور سوچنے کے حق کا حامل ہونا، جہاں آپ پر دوسروں کی طرف سے کوئی جبری پابندیاں عائد نہ ہوں، جن میں بااختیار حکام شامل ہیں۔ اس کا اطلاق آپ کی ذاتی، خاندانی اور سماجی زندگی پر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ آپ کے سیاسی خیالات اور دوسروں کے ساتھ آپ کے معاشی لین دین پر بھی۔

آزاد معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہوتا ہے جو ان آدرشوں کا علم بردار ہوتا ہے۔ تاریخی طور پر اور آج کے دور میں آزادی نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کامیابی کے ساتھ دولت تخلیق کرتی اور اسے شہریوں تک پھیلاتی ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ یہ انسانیت کی نہایت تخلیقی اور پیداواری قوتوں میں سے ایک قوت ہے۔ اس نے دنیا بھر میں لوگوں کی، خاص طور پر غریب ترین لوگوں کی زندگیوں کو بہتر بنایا ہے۔

آزادی کا مطلب ہے کہ آپ کے راستے میں کوئی رکاوٹیں کھڑی نہ کی جائیں، اور آپ اپنی مرضی سے جس طرح عمل کرنا چاہتے ہیں، اس میں کوئی پابندیاں عائد نہ کی جائیں۔ اس کا مطلب ہے دوسروں کی طرف سے مجبور نہ کیا جائے، ہدایت نہ دی جائے، دھمکی نہ دی جائے،

دہشت زدہ نہ کیا جائے، دباؤ نہ ڈالا جائے، کوئی چیز مسلط نہ کی جائے، دخل نہ دیا جائے یا بے وقوف نہ بنایا جائے۔ اس کا مطلب ہے اپنی زندگی گزارنے کے قابل ہونا، یوں کہ کوئی جارحیت نہ ہو، دھوکہ نہ دیا جائے، لوٹا نہ جائے یا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ ایسا اس لیے کیونکہ ایک آزاد معاشرے میں آزادی کے اصول کا اطلاق ہر کسی پر یکساں ہوتا ہے۔ ہم میں سے کسی کو دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرنے، انھیں روکنے یا نقصان پہنچانے کا حق حاصل نہیں، کیونکہ اس طرح انھیں جو آزادی حاصل ہے، اس کی نفی ہوگی۔

سو، آزادی اس حد تک وجود رکھتی ہے کہ دوسرے لوگوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اپنا مُکہ لہرانے کا آپ کا حق وہاں ختم ہو جاتا ہے، جہاں میری ناک شروع ہوتی ہے۔ آپ اپنی آزادی کا استعمال نہیں کر رہے، اگر آپ دوسروں کو دھمکی دیتے ہیں، ان پر جبر کرتے ہیں، انھیں لوٹتے ہیں، ان پر جارحیت کرتے ہیں یا انھیں قتل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس، آپ ان کی آزادی پر پابندی عائد کر رہے ہیں کہ انھیں کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ یہ ''کوئی نقصان نہیں'' اصول کہلاتا ہے: آپ جو چاہتے ہیں وہ کرنے کے لیے آزاد ہیں، بشرطیکہ آپ دوسروں کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔

اسی طرح، اگر آپ کسی کی طرف سے کی گئی جارحیت کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں، تو آپ کسی کی آزادی کو کم نہیں کر رہے۔ آزادی اور 'کوئی نقصان نہیں' کا اصول آپ کو یہ اجازت دیتے ہیں کہ اگر دوسرے آپ کو اور آپ کے عزیزوں کو نقصان پہنچاتے ہیں تو آپ انھیں روکیں۔ اگر کسی دوسرے، یا کسی اجنبی کو نقصان پہنچایا جاتا ہے، تو آپ نقصان پہنچانے والوں کو روکنے میں حق بجانب ہیں، گو کہ دوسرے شہریوں کو تحفظ دینے کا کام اکثر پولیس اور قانونی حکام کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

تاہم، 'کوئی نقصان نہیں' کے اصول کا اطلاق صرف دوسرے لوگوں کو پہنچائے جانے والے نقصان پر ہوتا ہے۔ یہ آپ کو اجازت دیتا ہے کہ آپ خود اپنے جسم اور خود اپنی ملکیت کے

ساتھ جس طرح چاہتے ہیں اس طرح پیش آئیں، بشرطیکہ اس عمل میں آپ دوسروں کی آزادی کو ختم نہ کریں۔ مثال کے طور پر، آپ اپنی ساری ملکیت کسی کو دے سکتے ہیں، کوئی خطرناک کام کر کے خود کو نقصان پہنچانے کا خطرہ مول لے سکتے ہیں، یا اپنے جسم کو زخمی کر سکتے ہیں، مگر اس حد تک جہاں تک آپ کا کوئی بھی اقدام دوسروں کو نقصان پہنچانے کا سبب نہیں بنتا۔ اور گو کہ دوسرے لوگ خود کو نقصان پہنچانے کی حوصلہ شکنی کی کوشش کر سکتے ہیں، مگر وہ بازو کے زور پر آپ کو روک نہیں سکتے۔ اگر یہ آپ کا سوچا سمجھا فیصلہ ہے۔

آزادی اور حکومت کا کردار

یہ بات کچھ سخت معلوم ہوگی کہ ہمیں دوسروں کے فعل و عمل میں دخل انداز ہونے کی آزادی نہیں، خواہ اس میں ان ہی کی بہتری کیوں نہ ہو۔ لیکن حقیقت میں ہم میں سے کوئی بھی یہ جان نہیں سکتا کہ اصل میں کیا چیز دوسروں کے مفاد میں ہے۔ افراد خود اپنی بہبود کے بہتر پرکھنے والے ہوتے ہیں۔ وہ خود اپنی اقدار، حالات، ضروریات، خواہشات، خوف، امید، مقاصد اور آرزوؤں کا، دوسروں کی نسبت، بہتر فہم رکھتے ہیں۔ وہ خود اپنے مقاصد اور خود اپنے اعمال کے بہترین پرکھنے والے ہوتے ہیں۔

اور یہ کہ اجنبی، دوسروں کی پرکھ کے ضمن میں تعصب کے حامل ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم لوگوں کو دوسروں کی آزادی میں مداخلت کی آزادی دے دیں، تو وہ اس طرح کے اعمال کر سکتے ہیں، جو (شعوری یا غیر شعوری طور پر) دوسرے شخص کے فائدے کے بجائے خود انھیں فائدہ پہنچاتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں پر پابندی لگانے سے متعلق فیصلوں کو پولیس اور عدلیہ پر چھوڑا جاتا ہے، جو حقیقتاً ایک آزاد معاشرے میں، اس معاملے کے ضمن میں، کم از کم زیادہ غیر جانبدار ہو سکتے ہیں۔

تو ہم جو بھی ہیں، ہمارے انفرادی مقاصد ایک ایسے معاشرے میں بہترین طریقے سے پورے ہو سکتے ہیں، جہاں ہم آزاد ہوں۔ ایسے معاشرے میں حکومت کا کردار یہ ہوتا ہے کہ وہ

ہماری آزادی کو دوسرے لوگوں کی دست برد اور مداخلت سے تحفظ مہیا کرے؛ اور جہاں یہ پوری طرح موجود نہیں، وہاں اسے توسیع دے اور جہاں یہ نامکمل ہے، وہاں اس میں اضافہ کرے۔ جب لوگ اکٹھے ہو کر حکومت یا خود پر کسی مقتدر ادارے کو تشکیل دیتے ہیں، تو ان کے ذہن میں یہ ہوتا ہے: اس طرح اپنی آزادیوں کو گھٹانا نہیں، بڑھانا ہے۔

گو کہ عام طور پر حکومتیں اس طرح وجود میں نہیں آتیں۔ یہ لوگوں پر ایسے گروہوں کے ہاتھوں مسلط کر دی جاتی ہیں، جو اپنے مفادات کی خاطر، اختیار کے استعمال میں کوئی عار نہیں سمجھتے، بجائے اس کے کہ ہر کسی کی آزادی میں اضافہ کریں۔ اس طرح کی ڈکیتی، اکثریت کی پوری مرضی سے واقع ہوتی ہے، جو اقلیت کے استحصال سے مستفید ہوتے ہیں۔ لیکن آزادی کا تعلق تعداد سے نہیں: اگر اس کا کوئی پورا مفہوم ہے تو وہ یہ ہے کہ اس کا اطلاق یکساں طور پر پوری آبادی پر کیا جائے۔

حتیٰ کہ ایسی حکومتیں، جو دل سے مفادِ عامہ کے حق میں ہوتی ہیں، وہ بھی اکثر آزادی کو گھٹاتی ہیں، کیونکہ وہ 'کسی کو نقصان نہیں' کے اصول کو پوری طرح نہیں سمجھتیں یا اس کا احترام نہیں کرتیں، اور نہ ہی اس نقصان کو دھیان میں رکھتی ہیں، ان کی مداخلتیں جس کا سبب بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر، حکومتی سینسر کچھ خیالات اور الفاظ یا تصویروں کے اظہار یا ان کے نشر کرنے کو روک سکتا ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ غضبِ عامہ کا سبب نہ بن جائیں۔ مگر اس عمل میں ان کی آزادیِ افکار و اظہار کو پابند کر کے، وہ ذہین مصنفوں، مصوروں، فلم سازوں، صحافیوں اور دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے، ان کے کیریئر کو خراب کرتا ہے، اور انھیں ان کی محنت، ذہانت اور تخلیق کا پھل نہیں ملنے دیتا۔ اور جب ایک مرتبہ ریاستی سینسر شپ کا اصول قبول کر لیا جاتا ہے، تو جو اقتدار میں ہوتے ہیں، ان کے لیے اسے توسیع دینا بہت آسان ہو جاتا ہے، اور یوں وہ اپنی حکومت پر ہر قسم کی تنقید کو بھی ممنوع قرار دے دیتے ہیں، جیسا کہ ایسے تمام خیالات پر پابندی عائد کر دینا، جن سے انھیں خطرہ محسوس ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ پھر، نیک نیت حکام، آمدنیوں کو برابر کرنے کی غرض سے ٹیکس نافذ کر سکتے ہیں، اور یوں اس بات کو نظر انداز کر سکتے ہیں کہ یہ اقدام، خود ٹیکس دینے والوں کی اپنی ملکیت سے لطف اٹھانے کی آزادی کو کس طرح ختم کر دیتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے چوری ان کی اس آزادی کو ختم کرتی ہے۔ اور عام چوری کی طرح، سرکاری ضبطی کا خوف بھی، لوگوں کو یقینی طور پر سرمایہ کاری اور بچت سے روکتا ہے، جس کا نتیجہ جواباً پوری آبادی کی سلامتی اور خوشحالی پر نقصان دہ اثرات کی صورت میں نکلے گا۔

ایسی حکومتیں یہ دعویٰ ضرور کرتی ہیں کہ وہ یہ سب کچھ مفادِ عامہ کو سامنے رکھ کر کر رہی ہیں، مگر یہ کون جانتا ہے کہ مفادِ عامہ کیا ہے؟ مختلف لوگوں کے مفادات مختلف ہوتے ہیں، اور اکثر ایک دوسرے کے مفادات کے خلاف بھی۔ ان تمام مفادات کے درمیان توازن پیدا کرنا ناممکن کام ہے۔ لیکن افراد، خود اپنے مفادات کو بہتر جانتے ہیں اور ان کے حصول کے لیے بہتر طور پر عمل کرتے ہیں، بجائے اس کے کہ اجنبی حکام ان کے لیے یہ کام کریں، جو ان کے لیے اس کام کو کرنے کی خاطر سرکاری اختیار کو استعمال کرتے ہیں۔

جبر ایک برائی ہے۔ اور اگر چہ کچھ جبر کو، جیسا کہ جبر کو روکنے کے لیے جبر، ایک ضروری برائی کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے، پھر بھی ہمیں جبر کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آزادی کے بہت سارے وکیل یہ دلیل دیتے ہیں کہ تمام انسان 'فطری حقوق' کے حامل ہیں، جیسا کہ زندگی کا حق اور نجی ملکیت رکھنے کا حق، اور حکومت ہم پر جو اختیار رکھتی ہے، یہ اسے محدود کرتے ہیں۔ ہم دوسرے شہریوں کو یہ اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہمیں لوٹیں یا ہماری آزادی کو کم کریں، تو ہم حکومت کو ایسا کرنے کی اجازت کیوں دیں گے؟

تاہم، بیشتر انسانی تاریخ میں، لوگ آزاد نہیں رہے۔ حکومتیں لوگوں کے رضا کارانہ اقرار سے قائم نہیں ہوئیں، بلکہ انھوں نے مسلط کیں، جو طاقت کا استعمال کرنا چاہتے تھے۔

آزادی کے اخلاقی فوائد

آزادی لوگوں کو مکمل انسان بننے کا موقع دیتی ہے، اپنی ذہانت اور قابلیت کو اس طرح استعمال میں لاتے ہوئے، جس طرح وہ چاہتے ہوں؛ صرف انھیں ہی نہیں، ان کے گھرانوں کو اوران کے عزیز و اقارب کو بھی۔ ایک آزاد معاشرہ، تنہا اور خود غرض افراد کا ہجوم نہیں ہوتا؛ یہ مکمل اور سماجی انسانی شخصیات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ یہ چیز آزاد معاشرے کی اخلاقی جہت ہوتی ہے کہ یہ پوری انسانیت کے لیے مددگار رہتا ہے۔

آزادی کی روحانی اور ثقافتی جڑیں

جیسا کہ نوبیل انعام یافتہ معیشت دان، امرتیہ سین نے نشان دہی کی ہے، آزادی ایک آفاقی تصور ہے۔ یہ ابتدا سے بدھ مت تک، ایشیا سے لے کر مغرب تک، تمام مذاہب میں گہری جڑیں رکھتا ہے۔ بیس صدیوں سے بھی پہلے، ہندوستانی بادشاہ اشوکا نے آزادی اور رواداری کا علم بلند کیا۔ سولہویں صدی کا مغل بادشاہ اکبر رواداری پر کلاسیکی مشاہدات کا اظہار کر رہا تھا، جب یورپ میں مذہبی منحرفوں کو ''تعذیب'' کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ مغرب میں انھیں قبول کیے جانے سے خاصا قبل، مسلم معاشروں میں ابتدا ہی سے، معاشی آزادی اور کاروباریت کو قبول کیا جاتا تھا۔ ترکی مملوک یورپی شہنشاہوں کی نسبت کہیں زیادہ روادار تھے۔

دوسرے الفاظ میں، آزادی، دنیا کی تمام ثقافتوں اور مذہبوں کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ یہ کوئی خاص مغربی تصور نہیں، نہ ہی کوئی مادی تصور ہے، نہ ہی کسی ایسے معاشرے سے غیر ہم آہنگ، جو سخت سماجی اقدار پر مبنی ہو۔ درحقیقت، ایک آزاد معاشرہ ایسے لوگوں پر انحصار کرتا ہے، جو رضاکارانہ طور پر مشترک اصولوں اور ضابطوں کو قبول کرتے ہیں، جن کا مقصد نقصان، دھوکے، استحصال اور اختیار کے غلط استعمال کو روکنا ہوتا ہے؛ یہ ضابطے ایک ہم آہنگ سماجی نظم کو تخلیق کرتے ہیں، جس میں لوگ باہم زندہ اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں۔ اس بڑے ڈھانچے کے اندر، آزادی لوگوں کو خود اپنی اقدار کا فیصلہ کرنے، اپنی ثقافت کو قائم رکھنے اور اپنے

مذہبی معمولات کی پیروی کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ انھیں کسی ریاستی مقتدر کی طرف سے مسلط کی جانے والی اقدار، ثقافت اور معمولات کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔

بھروسے اور باہمی تعاون کی ثقافت

ایک آزاد معاشرہ عیاں طور پر اقتدار اور حاکمیت کی بنیاد پر نہیں چلتا، بلکہ یہ بھروسے اور باہمی تعاون کی بنیاد پر چلتا ہے۔ آزاد معاشرے میں دولت رضا کارانہ تبادلے سے وجود میں آتی ہے، یعنی لوگ مفید اشیا بناتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ ان کی تجارت کرتے ہیں۔ یہاں دولت لٹیرے اشرافی طبقات کی لوٹ اور قبضے کے حربوں سے وجود میں نہیں آتی، جو اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے عوام سے ٹیکس نچوڑتے ہیں، یا خود کو، اپنے خاندانوں اور اپنے حواریوں کو اجارہ داریاں اور مراعات عطا کرتے ہیں۔ پوری انسانی تاریخ میں بیشتر ملکوں میں زیادہ تر دولت یوں ہی جوڑی گئی ہے، یعنی استحصال کے ذریعے، جو جابرانہ طاقت پر مبنی تھا۔ جبکہ ایک آزاد معاشرہ، رضا کارانہ باہمی تعاون اور تبادلے کی کہیں زیادہ صحت مندانہ نیت پر انحصار کرتا ہے۔

کام کرنے کے لیے، رضا کارانہ تعاون اور تبادلہ، بھروسے کی موجودگی کا تقاضا کرتے ہیں، یا تو پھر لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے، یا ان کے پاس کوئی متبادل نہیں ہوتا (مثلاً جہاں حکومتیں اور ان کے حواری پیداوار پر کنٹرول رکھتے ہیں)۔ ایک آزاد معاشرے میں، لوگ انتخاب کی آزادی کے حامل ہوتے ہیں اور اپنے کاروبار کو کہیں اور منتقل کرنے میں بھی آزاد ہوتے ہیں، لہٰذا، پیداکاروں کے لیے موجودہ اور مستقبل کے ممکنہ گاہکوں کو قائل کرنا ضروری ہوتا ہے، کہ وہ دیانت دار ہیں۔ انھیں اپنے وعدوں کو پورا کرنا ہوتا ہے، یا ان کی ساکھ ختم ہوجائے گی اور ان کا کاروبار تباہ ہوجائے گا۔ اور زیادہ تر لوگوں کے لیے، ساکھ اور روزگار کا ممکنہ نقصان نہایت تشویش کی بات ہوتی ہے۔

ایک آزاد معاشرے کو اشرافی طبقات اوپر سے طاقت کے بل پر احکامات دے کر نہیں چلاتے۔ یہ بالکل فطری اور خودرو انداز میں عام لوگوں کے رضا مندانہ میل جول کے ذریعے چلتا

ہے، جسے بھروسے اور دیانت داری کی ثقافت سے تقویت ملتی ہے۔ جو ضابطے اور قاعدے اس خودرو تعاون کو چلاتے ہیں، وہ آزاد معاشرے میں اتنا فطری بن جاتے ہیں کہ لوگوں کو ان کے بارے میں سوچنا ہی نہیں پڑتا۔ وہاں کسی اتھارٹی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، جو لوگوں کو بتائے کہ وہ دیانت داری کے ساتھ اور بروقت کام کریں، یا یہ کہ سخت محنت کریں اور دوسروں کے ساتھ تعاون کریں۔ لوگ روزانہ فطرتاً ایسے ہی کرتے ہیں۔

آزاد معاشرے میں بھروسے اور تعاون کی ضرورت، مقتدرہ کے احکامات کے ذریعے چلائے جانے والے معاشروں کی نسبت، افراد اور گروہوں کے درمیان تعلقات کو بہت اہم بنا دیتی ہے۔ روحانی اقدار، خاندان، دوستیوں، آبادی، ورثے، ہمسائیگی اور لوگوں کی انجمنوں کے رشتے، مشترک مفادات کے ساتھ، زیادہ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ غیر آزاد معاشروں میں بہت سی حکومتیں، اس طرح کی انجمنوں کو اپنی اتھارٹی کے لیے خطرہ سمجھتی ہیں، اور/ یا انھیں کمزور کرنا، منتشر کرنا یا ختم کرنا چاہتی ہیں۔ عام طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے گروہ زیر زمین چلے جاتے ہیں۔ رضا کارانہ انجمنیں لوگوں کے لیے اس قدر اہم ہوتی ہیں کہ ان کے ساتھ لوگوں کی وفاداری حکومتی اداروں کی نسبت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

ذاتی مفاد اور ضابطے

آزاد معاشرے کو اوپر سے احکامات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ عام افراد کے ذریعے کام کرتا ہے، جو اپنے منصوبوں اور اعمال کو دوسرے لوگوں کے منصوبوں اور اعمال کے مطابق ڈھالتے رہتے ہیں۔ جو چیز انھیں ایسا کرنے کے قابل بناتی ہے، وہ مشترک ضابطوں اور اقدار کا ایک سادہ سا مجموعہ ہوتا ہے، جیسا کہ دیانت داری اور عدم تشدد، جو مختلف ذاتی مفادات کے حامل لوگوں کے درمیان تنازعے کو روکتا ہے۔

ایسے بنیادی ضابطے اور مشترک اقدار، افراد کو امن کے ساتھ رہنے کے لیے کہیں زیادہ اجازت عطا کرتی ہیں۔ یہ لوگوں کو اس بات کے لیے آزاد چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنے باہمی

مفادات کو کس طرح پورا کریں۔ مثال کے طور پر، ایک آزاد معاشرہ، لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ تجارت کرنے کی آزادی دیتا ہے، جس کے تحت وہ ایسی سودے بازی کرتے ہیں، جسے دونوں فریق فائدہ مند سمجھتے ہیں۔ اس بات کا فیصلہ کوئی اتھاریٹی نہیں کرتی کہ ان کے لیے کیا چیز مفید ہو سکتی ہے، نہ ہی وہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ ان کے مختلف مفادات کے درمیان توازن کیسے پیدا کیا جانا چاہیے، نہ ہی یہ فیصلہ کہ ان کے مفادات کی بہتر تکمیل کیسے ہو سکتی ہے، اور نہ ہی لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ لوگ اس منصوبے کی پیروی کریں۔ ایک آزاد معاشرے میں، لوگ خود یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا چیز خود ان کے مفاد میں ہے، اور یہ انتخاب بھی کرتے ہیں کہ ان مفادات کو دوسرے لوگوں کے ساتھ تعاون کر کے کیسے حاصل کیا جائے۔ اور وہ لین دین کے ایسے تمام معاہدے کرنے میں آزاد ہوتے ہیں، جن کا وہ انتخاب کرتے ہیں، تا آنکہ اس عمل میں کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچتا ہو۔

کچھ تنقید کرنے والے یہ سمجھ نہیں سکتے کہ ایک معاشرہ کیسے چل سکتا اور کیسے خوشحال ہو سکتا ہے، جب تک کہ یہ مشترک مقاصد طے نہ کر لے اور دوسرے تمام شہریوں کو ان کے حصول کے لیے کام کرنے کی طرف مائل نہ کر لے۔ انھیں یہ خوف ہوتا ہے کہ ایک آزاد معاشرہ، مستقل، غیر پیداواری، اور نجی مقاصد کے ٹکراؤ پر مشتمل ہوگا، جسے لازماً دبا دینا چاہیے تاکہ مفادِ عامہ قائم ہو سکے۔

یہ غلطی ہے۔ ایک آزاد معاشرہ اس بات کو قبول کرتا ہے کہ لوگ ذاتی مفاد کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اس بات کو بھی قبول کرتا ہے کہ ذاتی مفاد اس قدر شدید محرک ہوتا ہے کہ اسے دبایا نہیں جا سکتا۔ لوگ 'مفادِ عامہ' کو، حکام اس کی جو تعریف کرتے ہیں، خود اپنے ذاتی مفاد کی نسبت کم ضروری اور کم اہم سمجھتے ہیں۔ اور ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ذاتی مفاد واقعتاً مفید اور اہم ہوتا ہے: اگر افراد خود اپنی بنیادی ضروریات (جیسا کہ خوراک، مشروب، رہائش، اور لباس) کو نظر انداز کر دیں، تو وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکیں گے، قطع نظر اس سے کہ وہ جتنا زیادہ فلاح پسند

معاشرے میں نہ رہتے ہوں۔

ایک آزاد معاشرہ، ذاتی مفاد کو مفید طریقوں سے بروئے کار آنے دیتا ہے۔ یہ کسی یوٹیوپیا تخلیق کرنے کی بے سود امید میں انھیں دباتا نہیں۔ بس ضابطوں کا ایک مجموعہ درکار ہوتا ہے کہ لوگ دوسروں پر اپنے مقاصد مسلط نہ کریں۔ لوگ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں آزاد ہوتے ہیں، انفرادی طور پر بھی اور دوسروں کے ساتھ شراکت میں بھی، تاآنکہ وہ دوسروں کی بھی ایسا ہی کرنے کی آزادی کا احترام کریں۔ وہ دوسروں کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ خود ان کے مخصوص مقاصد کو قبول کریں اور ان کے حصول میں مدد دیں۔

تنقید کرنے والوں کو یہ خوف ہوتا ہے کہ ایک آزاد معاشرہ مخالف مفادات کی مسلسل جنگ کا شکار ہوگا، لیکن یہ حقیقت اس بات کو جھٹلاتی ہے کہ نسبتاً آزاد معاشرے بالضرور خوشحال ہوتے ہیں، اور ان معاشروں کی نسبت قریب قریب ہمیشہ زیادہ خوشحال ہوتے ہیں، جہاں کنٹرول قائم ہوتا ہے۔ ضابطوں کے ایک سادہ سے مجموعے کے استعمال سے، جس کے تحت لوگ دوسروں کی آزادی کا احترام کرتے ہیں، یہ معاشرے ذاتی مفاد کو مفید تعاون اور اشتراک میں ڈھال دیتے ہیں۔

اسی طرح یہ خوف بھی غلط ہے کہ ایک آزاد معاشرے میں افراد صرف اپنے مفادات کے حصول میں مصروف ہو جائیں گے۔ انسان، سماجی مخلوق ہیں۔ وہ فطری طور پر خاندان، دوستوں اور ہمسائیوں سے جڑے ہوتے ہیں، جن کے مفادات کو وہ اپنے اعمال میں پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ دوستوں کے احترام اور خوشنودی، اور ایک اچھے ہمسائے کی شہرت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ اپنی مرضی سے اپنے مفادات کو کم کر لیتے ہیں، تاکہ وہ دوسروں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھ سکیں۔ انھیں اس سوچ کا صلہ ملتا ہے، کیونکہ یوں اس بات کا امکان بڑھ جاتا ہے کہ دوسرے جواباً ان کے ساتھ اسی طرح پیش آئیں گے۔

زیادہ آزاد معاشروں میں ہم ایسا ہوتا دیکھ سکتے ہیں۔ نجی فیاضی کے ذریعے، دوسروں کی مدد کرنا، جس میں بالکل اجنبی لوگ بھی شامل ہیں، کم آزاد معاشروں کی نسبت کہیں زیادہ ہے،

اس لیے نہیں کہ وہاں لوگ زیادہ دولت مند ہیں، بلکہ اس لیے کیونکہ آزاد معاشرے، تھوپی گئی سماجی ذمے داریوں کی نسبت رضاکارانہ ذمے داریوں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

متفقہ ضابطوں کے ذریعے تعاون

ایک دوسرے کے ساتھ کامیاب تعاون کی خاطر، ہم سب کو اس بات ضرورت ہوتی ہے کہ ہمارے اعمال پیش بینی اور بھروسے کے قابل ہوں۔ تعاون ممکن ہی نہیں ہوگا، اگر لوگ مستقل طور پر اپنا ذہن تبدیل کرتے رہیں، بے تکے انداز میں عمل کریں، اور اپنے وعدوں سے پھر جایا کریں۔ ایک آزاد معاشرہ لوگوں کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگیوں میں جیسے چاہیں اس طرح پیش آئیں، بشرطیکہ اس سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے۔ لیکن یہ اس بات کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے کہ ان کے طرزِ عمل میں مستقل مزاجی ہو، جو سماجی تعاون کے لیے لازم ہے۔

مثال کے طور پر ایک آزاد معاشرہ، ملکیت، اور اس کے کنٹرول اور منتقلی کے بارے میں قانونی ضابطوں کا حامل ہوتا ہے۔ یوں لوگ آزادی سے ملکیت حاصل کرتے ہیں، اور سرمایہ جاتی اشیا، سرمایہ کاری، گھر، کارخانے اور ساز وسامان حاصل کرتے ہیں، جس سے ان کی مستقبل کی زندگیوں میں بہتری آئے گی، اور یوں پیداوار میں بھی آسانی اور سستا پن آئے گا، اور اس طرح دوسرے لوگوں کے ہاتھوں یا حکام کے ہاتھوں لٹنے کا، یا استحصال کا خوف بھی نہیں ہوگا۔ یہ ضابطے ('ملکیتی حقوق') حکومتوں نے نہیں بنائے، بلکہ ان کی افزائش صدیوں میں ہوئی ہے۔ انھیں لاتعداد تنازعوں اور لاتعداد عدالتوں میں آزمایا گیا ہے، یوں قانون اور عمل کا ایک دفتر تیار ہوا، اور یہ لوگوں کو دوسروں کے ساتھ اپنے لین دین میں زیادہ محفوظ بناتے ہیں، اور اس طرح تعاون، زیادہ آسان اور زیادہ فائدہ مند ہوتا جاتا ہے۔

زیادہ آزاد معاشروں نے بہت سے دوسرے ضابطے اور قاعدے بھی قبول کر لیے ہیں، جنھیں ہم آہنگ سماجی تعاون کے لیے لازمی سمجھا جاتا ہے۔ اخلاقی ضابطے ایسی حدیں قائم

کرتے ہیں، جوسماجی میل جول کو ہرکسی کے لیے آسان تر بناتی ہیں۔اور سماجی طرزِعمل کے عمومی معیار بھی ہیں، جیسے کہ ادب آداب، شائستگی اور اچھے کاروباری عمل کے اصول، جو انسانی میل جول کے ذریعے رفتہ رفتہ ایک طویل عرصے میں وجود پاتے ہیں۔ ایسے مفید اصول، گو کہ زیادہ آزاد معاشروں میں عام ہوتے ہیں، کم آزاد معاشروں کی حکومتوں کے لیے انھیں بنانا یا اپنانا مشکل یا ناممکن ہوسکتا ہے۔

ایک آزاد معاشرے کے شہری کچھ بنیادی حقوق کے حامل بھی ہوتے ہیں۔ ان کی اصل صورت مختلف ہوسکتی ہے، مگر قبول کیے جانے والے ان اصولوں میں جبری محنت یا غلامی سے آزادی، اور تشدد یا جرائم کے لیے غیر متناسب سزائیں شامل ہوتی ہیں۔اور دھمکی اور تنبیہوں کے بغیر سیاست میں حصہ لینے کی آزادی۔ ان میں تقریر کی آزادی شامل ہے، یعنی خود کے اظہار کی آزادی اور رابطے کے ذرائع (ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبارات اور انٹرنیٹ) کی آزادی، تاکہ وہ جیسے وہ چاہیں، اس کے مطابق رپورٹ اور تبصرہ کریں۔ ان میں اکٹھے ہونے اور جس کے ساتھ آپ چاہیں انجمن بنانے کی آزادی شامل ہیں۔ اور ان میں پرائیویسی (رازداری) شامل ہے، یعنی دوسرے، خاص طور پر وہ جو حکومت میں ہیں، ان کی جاسوسی اور نگرانی نہ کریں۔ مختصر یہ کہ آزاد معاشرہ چاہتا ہے کہ شہری، لوگوں کے تصورات، اعتقادات، طرزِ حیات، اور اعمال کے بارے میں روادار ہوں، اور 'کوئی نقصان نہیں' اصول کی رو سے ان کے معاملات میں مداخلت نہ کریں۔

انصاف اور قانون کی حاکمیت

ایک آزاد معاشرہ، انصاف کے ضابطوں کا حامل بھی ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں کو نقصان پہنچانے کی صورت میں سزائیں دی جاتی ہیں، نہ صرف جسمانی نقصان بلکہ دھوکہ اور دوسرا نقصان بھی۔ اور شاید یہ نہایت اہم ہے، ایک آزاد معاشرہ، قانون کی حاکمیت قائم کرتا ہے۔ سیاسی تنظیم کا بڑا مسئلہ یہ نہیں کہ اپنے قائدین کا انتخاب کیسے کیا جائے، یہ تو آسان ہے، بلکہ بڑا مسئلہ یہ ہے کہ قائدین پر پابندیاں کیسے عائد کی جائیں۔ ایک آزاد معاشرے میں، حکومتی اہل کاروں کا

کردار اور اختیار سختی سے محدود ہوتا ہے۔ یہ چیز اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ شہریوں کو جارحیت سے تحفظ دینے اور غلط کاری کی سزا دینے کے لیے انھیں جو اختیار دیا گیا ہے، وہ اسے بلا جواز استعمال نہ کریں یا جنھیں یہ اختیار دیا گیا ہے، وہ اسے ذاتی مفاد کے لیے استعمال میں نہ لائیں۔

آزاد معاشروں نے ہر قسم کے مختلف میکانزم تیار کیے ہیں، جیسے کہ انتخابی قانون، آئین اور اختیارات کی جداگانہ تقسیم، تاکہ سرکاری اختیار کو پابند بنایا جا سکے۔ لیکن شہریوں کو ان کے حاکموں کے استحصال سے تحفظ دینے کا بنیادی طریقہ اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ ہر کسی پر قوانین کا یکساں اطلاق ہو۔ یہی چیز قانون کی حاکمیت کہلاتی ہے۔ اس اصول کے تحت، ایک حکومت، مثلاً، مخصوص قبیلوں کو نوازشات یا مراعات عطا نہیں کر سکتی، نہ ہی مخصوص سماجی گروہوں پر ٹیکس تھوپ سکتی ہے۔ اور قوانین کا اطلاق خود حکومت پر بھی ہونا ہے جس طرح ان کا اطلاق عوام پر ہونا ہے۔

ان قوانین کے نفاذ پر بھی اسی بات کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ عدالتی اختیار کا استعمال غیر جذباتی انداز میں ہوتا ہے اور بے بنیاد انداز میں نہیں، ایک آزاد معاشرے میں انصاف کے ضابطوں کا اطلاق یکساں انداز میں ہوتا ہے۔ شہری اس بات کے حق دار ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے اور انھیں انصاف کے ضروری مراحل دستیاب ہوں۔ یہ چیزیں اس میں شامل ہیں کہ انھیں بغیر کسی وجہ کے گرفتار نہ کیا جائے، بغیر مقدمہ چلائے انھیں قید میں نہ رکھا جائے، شہادت کے ضابطوں کے مطابق ان پر منصفانہ انداز میں مقدمہ چلایا جائے، سرکاری حکام کے بجائے، عام شہریوں پر مبنی جیوری حکم صادر کرے، اور یہ کہ ایک ہی جرم کے لیے بار بار مقدمہ نہ چلایا جائے۔

سیاست دانوں، سرکاری اہل کاروں اور ججوں پر ان تمام پابندیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ اختیار لوگوں میں اس کے غلط استعمال میں کمی واقع ہوتی ہے، خصوصی مراعات کو نقصان پہنچتا ہے اور جبر میں کمی آتی ہے۔ ایک آزاد معاشرے میں حکومت کا کردار آخرِ کار افراد کی آزادی

کا تحفظ اور اس تحفظ کی توسیع ہوتی ہے، اس میں کمی نہیں۔

آزادی کے معاشی فوائد

معیارِ زندگی میں ازحد اضافہ

اٹھارہویں صدی کے وسط کی دہائی تک، انسانی زندگی میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ قریب قریب ہر کوئی باہر زمین پر کام کرتا تھا، یہ خوارک کی فراہمی سے تعلق رکھنے والی سرگرمی تھی، جس کے لیے سخت محنت درکار تھی، جو غیر یقینی حالات اور موسم کا شکار تھی۔ زراعت کے طریقے ان طریقوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے، جیسے کہ وہ فرعونوں کے دور میں تھے۔ بیشتر لوگوں کے پاس ایسی تعیّشات کے لیے پیسہ نہیں ہوتا تھا، جیسا کہ کپڑوں کا ایک فالتو جوڑا۔ چند لوگ ہی گوشت کھا سکتے تھے۔ دولت مند نظر آنے والے لوگ بس وہی تھے، جو دولت مند پیدا ہوتے تھے۔ اور عام طور پر یہ دولت خود اپنے فائدے کے لیے کسان آبادی پر ٹیکس لگانے کے اختیار سے پیدا ہوتی تھی، یا کسی ایسے شخص کا ملازم یا دوست ہونے سے، جس کے پاس یہ اختیار ہوتا تھا۔

زیادہ تر لوگوں کے لیے یہ ایک آفت زدہ زندگی تھی۔ معیشت دان، دیردرا مک کلاسکی کے حساب کتاب کی رو سے، 1800ء میں، دنیا کے عام شہری کی اوسط آمدنی ایک ڈالر روزانہ تھی، جو آج دنیا کے بیشتر صدر مقاموں میں کافی کے ایک کپ کے لیے مشکل سے کافی ہو گی۔ اب دنیا کی اوسط آمدنیاں 50 ڈالر روزانہ کے قریب ہوں گی۔ یہ خوشحالی میں بہت بڑا اضافہ ہے۔

لیکن یہ تو بس ایک اوسط ہے، جو یہ بتاتی ہے کہ بعض ممالک، خوشحالی کے حصول میں کامیاب رہے ہیں، دوسرے ممالک نہیں۔ تاجکستان دنیا کے کم آزاد ملکوں میں سے ہے، وہاں اوسط آمدنیاں 7 ڈالر روزانہ ہیں۔ لیکن ریاست ہائے متحدہ میں، جو زیادہ آزاد ملکوں میں سے ہے، اوسط آمدنیاں 100 ڈالر روزانہ سے زیادہ ہیں۔ آزادی کے فائدوں کی بدولت، آج امریکی، تاجکستان کے لوگوں کی نسبت 14 گنا زیادہ دولت مند ہیں، اور 1800ء میں اپنے آباو

اجداد کی نسبت 20 اور 100 گنا زیادہ دولت مند ہیں۔ سویٹزرلینڈ، آسٹریلیا، کینیڈا اور برطانیہ میں، جو ''دنیا کی معاشی آزادی کی رپورٹ'' کے مطابق زیادہ آزاد ملکوں میں شمار ہوتے ہیں، اوسط آمدنیاں 90 ڈالر روزانہ سے زیادہ ہیں۔ آزادی اور خوشحالی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

اسی لیے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ لوگ، غریب اور کم آزاد ملکوں کو چھوڑ رہے ہیں، اور دولت منداور زیادہ آزاد ملکوں کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ ہر برس، 20 کم آزاد ملکوں میں ایک ہزار لوگوں کی آبادی میں سے کوئی 1.12 لوگ، آنے کے بجائے باہر جا رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں، 20 زیادہ آزاد ملکوں میں ایک ہزار لوگوں میں سے 3.81 لوگ بجائے باہر جانے کے آ رہے ہیں۔ اور جو 20 ملک سب سے زیادہ آزاد ہیں، وہاں ہجرت کر کے آنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اوسطاً، وہ ملک جو آزادی کے پیمانے کے نچلے نصف میں شامل ہیں، وہاں سے لوگ ہجرت کر رہے ہیں، جبکہ جو ملک بالائی نصف میں شامل ہیں، وہاں لوگ آ رہے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں، لوگ آزادی کے حق میں اپنے پاؤں سے ووٹ دے رہے ہیں۔ اور گو کہ غیر آزاد ملک انھیں ہجرت کرنے سے روکنے کے لیے اپنی بہترین کوششیں کر رہے ہیں، اور زیادہ آزاد ملک انھیں ہجرت کر کے اپنے ملکوں میں آنے سے روکنے کے لیے پابندیاں عائد کر رہے ہیں، اس کے باوجود لوگ ایسا کر رہے ہیں۔

آزادی اور فیاضی

یہ خود اپنے غریب لوگوں کا استحصال نہیں، جو آزاد ملکوں کو خوشحال بناتا ہے۔ جیسا کہ روسی اخلاقی فلسفی لیونِد نکونوف کا کہنا ہے، قومی آمدنی کا اوسط حصہ، جو زیادہ آزاد اور کم آزاد ملکوں کی آبادی کے غریب ترین دسویں حصے کو ملتا ہے، وہ قریب قریب ایک جیسا ہے (2.58 فیصد اور 2.47 فیصد بالترتیب)۔ لیکن ایک دولت مند ملک میں غریب رہنا کہیں بہتر ہے (جہاں غریب ترین دسواں حصہ اوسط 23 ڈالر روزانہ کماتا ہے)، بجائے اس کے کہ ایک غریب ملک میں غریب رہا جائے (جہاں غریب ترین دسواں حصہ 2.50 ڈالر روزانہ کماتا ہے)۔

آزاد، دولت مند ملکوں میں غریب لوگوں کی دولت تک رسائی زیادہ ہے۔ ان کے غریب ترین شہری مستقل طور پر خود دولت کمانے کے عمل سے باہر نہیں کیے جاتے، جیسا کہ کم آزاد ملکوں میں ہوتا ہے، جہاں انھیں جو صحیح خاندان، ذات، نسل یا مذہب یا سیاسی گروہ سے تعلق نہیں رکھتے، دولت کمانے کے عمل سے باہر کر دیا جاتا ہے۔ زیادہ آزاد ملکوں میں اوپر کی طرف سماجی حرکت زیادہ ہوتی ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ دنیا کے امیر ترین شخص، مائیکروسافٹ کے بانی، بل گیٹس نے اپنا سافٹ ویئر کا کاروبار ایک گیراج میں شروع کیا۔

اور اب بل گیٹس کا ارادہ ہے کہ اپنی ساری دولت خیر خواہی کے کاموں کے لیے وقف کر دیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہوتا ہے: نجی فیاضی بھی زیادہ دولت مند ملکوں میں بہت زیادہ ہے۔ ''بارکلیز ویلتھ'' کے ایک جائزے کے مطابق فلاحی کاموں کے لیے پیسہ دینا، پانچ دولت مند امریکیوں میں سے دو امریکیوں کی سرفہرست اخراجاتی تین ترجیحات میں سے ہے۔

برطانیہ کے ''چیریٹیز ایڈ فاؤنڈیشن'' کے مطابق ایسے پانچ ملک، جہاں لوگ فلاحی کاموں کے لیے عطیہ اور وقت دینے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، وہ آسٹریلیا، آئرلینڈ، کینیڈا، نیوزی لینڈ، اور ریاست ہائے متحدہ ہیں، اور آزادی کے ضمن میں ان سب کا درجہ بہت اونچا ہے۔ اور ان ملکوں میں، غریب اور کم آزاد ملکوں کی نسبت، سب لوگوں کے پاس عطیہ کرنے کے لیے زیادہ دولت ہے۔

آزادی، امتیاز پسندی کو مٹاتی ہے

غیر آزاد ملکوں میں، امتیاز پسندی بہت عام ہے۔ اگر آپ صحیح طبقے، ذات، جنس یا خاندان سے نہیں، تو آپ کو اچھی نوکری ملنا یا بہتر خدمات کا حصول مشکل ہو سکتا ہے۔ لیکن آزاد بازار کی معیشتیں، امتیاز پسندی کو نچوڑ کر باہر نکال دیتی ہیں۔ آزاد معاشروں میں پیدا کار اس ضمن میں کہ کس کے ساتھ تجارت کرنی ہے یا کسے ملازم رکھنا ہے، امتیاز پسند ہونا گوارا نہیں کر سکتے۔

مثلاً روزگار دینے والے مہاجروں کو ناپسند کر سکتے ہیں، خاص طور پر اگر ان کا تعلق ایک

مختلف ثقافت، نسل، یا مذہب سے ہے۔ لیکن مہاجر گروہ کسی کام کے لیے کم اجرت بھی قبول کر سکتے ہیں، بلکہ کرتے ہیں۔ یوں، ایسے روزگار دینے والے، جو صرف مقامی محنت کشوں کو کام دے کر امتیاز برتتے ہیں، وہ مقابلے میں خود کو نقصان اٹھاتا پاتے ہیں۔ ان کا اجرتوں کا خرچہ، جن کے ساتھ ان کا مقابلہ ہے، ان کی نسبت بہت زیادہ ہوگا، جو مہاجروں کو روزگار دینے پر راضی ہوں گے۔ ان کا نفع بھی کم ہوگا، یا انھیں اشیا کی قیمتیں زیادہ رکھنی ہوں گی، اور یوں انھیں کاروبار میں نقصان اٹھانے کا خطرہ ہوگا۔ کاروبار کے لیے یہ چیز نقصان دہ ہے۔ امتیاز برتنا روزگار دینے والوں کے فائدے میں نہیں ہوگا۔

ملکی محنت کشوں کے مابین بھی، آزاد بازار معیشت، امتیاز کو نچوڑ کر باہر نکال دیتی ہے۔ مثال کے طور پر عورتوں کے باہر جا کر کام کرنے کے خلاف ثقافتی ناپسندیدگی موجود ہو سکتی ہے، اور یوں ان کے لیے نوکری حاصل کرنا بہت مشکل ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسے روزگار دینے والوں کے لیے ذہانت کا ذخیرہ بہت چھوٹا ہوگا، جس سے وہ فائدہ اٹھائیں، بجائے ان روزگار دینے والوں کے جو یہ امتیاز نہیں برتیں گے۔ ایک اور دلچسپ مثال بھارت میں ذات پات کی تقسیم ہے۔

حیدرآباد جیسے مراکز میں ہائی ٹیک صنعتوں کے عروج نے نچلی ذاتوں کے بھارتی محنت کشوں کے لیے روزگار کے مواقع کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس صنعت میں، جس میں مقابلہ بہت زیادہ ہے، روزگار دینے والوں کو ذہانت کے حامل لوگ چاہییں۔ یہ ذات، یا کسی اور ثقافتی عامل کی بنیاد پر امتیاز برتنا گوارا نہیں کر سکتے۔ وہ چیز جسے امتیاز کے خلاف قوانین دہائیوں میں حاصل کرنے میں ناکام رہے، آزاد کاروبار کرنے والے لوگوں کے ذاتی مفاد نے اسے چند برسوں میں حاصل کر لیا۔

آزاد لوگوں کی تخلیق پسندی

زیادہ آزاد معیشتیں زیادہ دولت مند کیوں ہیں، اس کا ایک سبب یہ ہے کہ یہ ساری دستیاب ذہانت کو استعمال میں لاتی ہیں۔ چونکہ یہاں لوگوں کو امتیاز کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، آزاد

معاشرے کے تمام شہری اپنے ذہنوں اور قابلیتوں کو کام میں لانے کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔ اگر وہ اشیا تخلیق کرتے، بہتر بناتے اور انھیں دستیاب بناتے ہیں، جو دوسرے لوگوں کی زندگی میں بہتری لاتی ہیں، تو دوسرے لوگ ان کی اشیا خرید کر انھیں اس کا صلہ دیں گے۔ یوں، آزاد معاشرے زیادہ تخلیقی اور جدت پسند ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ تیزی سے ترقی کرتے ہیں۔

معاشی آزادی لوگوں کے ذاتی مفاد کو سماجی فائدے کے لیے کام میں لاتی ہے۔ آپ ایسی اشیا بناتے ہیں، جو دوسروں کی ضرورت پوری کرتی ہیں، اور وہ اپنی مرضی سے ایسی اشیا کے لیے ادائیگی کرتے ہیں۔ اور آپ چاہتے ہیں کہ وہ بار بار آپ کے پاس آئیں، اور اپنے تمام دوستوں کو بتائیں کہ آپ کتنے اچھے ہیں۔ یہی چیز ہے جو پیداکاروں کو خود اپنے بجائے، اپنے گاہکوں پر متوجہ رکھتی ہے۔ زیادہ آزاد معاشروں کے بیشتر معروف کاروباری لوگ بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے گاہکوں سے منافع کھینچنے کے بجائے، ان کی خواہشوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے پر زیادہ توجہ دی اور اسی چیز نے ان کے کاروبار کو کامیاب بنایا۔

آزاد معیشتوں کو غلط انداز میں یہ نام دیا جاتا ہے کہ وہاں لوٹ مار ہوتی ہے، مگر حقیقت اس سے کہیں زیادہ مختلف ہے۔ صحیح آزاد معیشت، باہمی تعاون کا ایک نظام ہوتا ہے، جو آزاد لوگوں کے درمیان جبر کے بجائے رضاکارانہ تجارت اور تبادلے پر مبنی ہوتا ہے۔

سرمائے کی تخلیق

آزاد معیشتیں، پیداواری سرمائے کو تشکیل دینے کے ساتھ ساتھ جدت پسندی اور گاہکوں کی خدمت کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہیں۔ جال کے ذریعے مچھلی پکڑنا، ہاتھ سے مچھلی پکڑنے کی نسبت بہت آسان ہے، لیکن اس کا مطلب پہلی دفعہ کم مچھلیاں پکڑنا ہے، کیونکہ آپ کو محنت کر کے جال بنانا ہوگا۔ خرچ کو کم کر کے، آپ سرمایہ جمع کر سکتے ہیں، اور یوں مستقبل کی پیداوار کو بہت زیادہ کارآمد بنا سکتے ہیں۔

یہی چیز سرمایہ پسندی کی بنیاد ہے۔ لوگ سرمایہ تعمیر کرتے ہیں، جیسے کہ گھر، کارخانے، اور مشینری، جو ان کی زندگی کو زیادہ آسان، اور ان کی محنت کو زیادہ پیداواری بناتے ہیں (عام طور پر بہت زیادہ پیداواری: ذرا سوچیے زمین پر ہاتھوں سے ہل چلانے کی نسبت ٹریکٹر چلانے میں کتنی زیادہ کوشش درکار ہوتی ہے اور ان میں کتنا فرق ہے)۔ اور یہ عمل جمع کرنے پر مشتمل ہے: پیداواری ٹیکنالوجی میں ہر اضافہ اور ہر بہتری، پیداوار میں اضافہ کرتی ہے اور کوشش میں کہیں زیادہ کمی لاتی ہے۔

ایک آزاد معاشرہ اس پیداواری سرمائے کو جمع کرسکتا ہے اور اپنی پیداواریت اور اپنی خوشحالی کو بڑھائے جا سکتا ہے، صرف اس وجہ سے کہ یہ اپنے لوگوں کو مکان، کارخانے، مشینری اور دوسری سرمایہ جاتی اشیا کا مالک بننے کی اہلیت دیتا ہے، اور ان میں ایسا کوئی خوف نہیں رہنے دیتا کہ انھیں ضبط یا چوری کیا جا سکتا ہے۔ یہ ضبطی کے خلاف لوگوں کا دفاع کرتا ہے اور یہ جائیداد کی ملکیت سے متعلق اخلاقی اور قانونی ضابطوں کا حامل ہوتا ہے، جو چوری کے امکان کو کم کرتے ہیں۔

آزاد معاشرے اور آزاد معیشت کی ایک نہایت اہم خصوصیت، قانون اور ثقافت کے ذریعے جائیداد کی ملکیت کا تحفظ ہوتا ہے۔ آخرِ کار، اگر کسان یہ سمجھتے ہوں کہ ڈاکو ان کی فصل کو لوٹ لیں گے، تو چند ہی کسان ایسے ہوں گے، جو بیج بونے، پودے لگانے، اور فصل کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کریں گے۔ اسی طرح، چند لوگ ہی، جتنا ضروری ہو، اتنے کام سے زیادہ کم ہی کام کریں گے، اگر ان کی زیادہ تر آمدنی ٹیکسوں کی صورت میں لے لی جائے گی۔ خاندان بچت نہیں کریں گے، اگر افراطِ زر کے ڈاکے یا ٹیکس کے ذریعے ان کا پیسہ چرا لیا جائے گا۔ کاروباری اپنے کاروبار میں سرمایہ کاری نہیں کریں گے، اگر ان کے اثاثے بغیر تلافی کے قومیا لیے جا سکتے ہوں۔ ایسی مراعات، جو پسندیدہ اشرافی طبقات کے فائدے کے لیے، بازار کو بگاڑتی ہیں، اس بات کے امکان کو کم کرتی ہیں کہ نئے کاروبار جنم لیں گے۔

اور چوروں یا حکومتوں کے ہاتھوں یہ استحصال جتنا زیادہ ہوگا، کام کرنے، بچت کرنے

اور ترقی کرنے کے خلاف عدم ترغیب بھی اتنی زیادہ ہوگی۔ چودھویں صدی کا مسلمان عالم اور قانون دان، ابن خلدون اس نکتے کو بخوبی سمجھتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

''یہ معلوم ہونا چاہیے کہ لوگوں کی جائیداد پر حملے اس ترغیب کو ختم کر دیتے ہیں کہ لوگ جائیداد حاصل کریں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اس طرح لوگوں کی رائے یہ بنتی ہے کہ ان کے جائیداد حاصل کرنے کا مقصد اور انجام یہ ہے کہ اسے ان سے چھین لیا جائے۔ جب جائیداد حاصل کرنے اور رکھنے کی ترغیب ختم ہو جائے تو لوگ کوئی بھی جائیداد بنانے کی کوشش بالکل نہیں کرتے۔ جائیداد سے متعلق حقوق جس حد تک اور جس درجے تک چھینے اور ختم کیے جاتے ہیں، وہی چیز اس حد اور درجے کا تعین کرتی ہے جس حد اور درجے تک رعیت میں جائیداد حاصل کرنے کی کوششیں کم ہوگئی ہیں۔''

جائیداد اور ترقی

لیکن اپنی ملکیت کے تحفظ کی ضمانت، آپ کو خود اپنے اور اپنے خاندان کے مستقبل کے تحفظ کی ضمانت بھی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ خود اپنے گھر کے مالک ہوتے ہیں، جبکہ بہت سے ملکوں میں لوگ مالک نہیں ہو سکتے، تو کہیں نہ کہیں آپ کے پاس ایک جائے پناہ ہے، جہاں سے آپ اپنی زندگی کو جی سکتے ہیں۔ آپ ایک اثاثے کے مالک بھی ہیں، جس کی مدد سے آپ کوئی کاروبار شروع کرنے کے لیے قرض لے سکتے ہیں، اور خود اپنا پیداواری سرمایہ تعمیر کر سکتے ہیں، بجائے اس کے کہ آپ ہمیشہ دولت مند اشرافیہ کے رحم و کرم پر زندہ رہیں۔ یہ آپ کو ایک مالی سہارا مہیا کرتا ہے، جس کے ذریعے آپ نئی چیزوں کے تجربات کرنے میں آزاد ہوتے ہیں، جیسا کہ اپنی نوکری چھوڑنا اور کوئی اور نوکری تلاش کرنا، یا کسی اور کاروبار کے لیے پیسہ حاصل کرنا۔

جائیداد کی محفوظ ملکیت، سپیشلائزیشن (اختصاص) اور تجارت کو فروغ دیتی ہے، جس سے انسانی پیداواریت میں اضافہ ہوتا ہے اور یوں انسانی دولت بڑھتی ہے۔ ہماری زندگیاں بہت ہی بدحال ہوں گی، اگر ہمیں اپنا ہر کام خود کرنا پڑے، جیسا کہ خود اپنی خوراک پیدا کرنا، اپنے

لیے خود پانی حاصل کرنا، اپنے لیے خود ایندھن تلاش کرنا، اپنے کپڑے خود بنانا، اپنے لیے گھر خود تعمیر کرنا، یا حملے کی صورت میں خود اپنا دفاع کرنا۔ ہم میں سے چند ہی لوگ ہوں گے، جو یہ تمام چیزیں کرنے کی مہارت رکھتے ہوں گے، اور ہمیں ان تمام کاموں کو آسانی اور تیز رفتاری سے کرنے کے لیے درست اوزار چاہیے ہوں گے۔ لیکن اگر لوگوں کی جائیداد کی ملکیت کا احترام کیا جاتا ہے، تو ہمیں ہر چیز خود نہیں کرنی پڑتی۔ ایک کام تیز رفتاری سے کرنے کے لیے، لوگ خاص قسم کے اوزار بنا سکتے ہیں، اور پھر ان اوزاروں کو ہم جو باقی لوگ ہیں، انھیں بیچ سکتے ہیں۔ کسان، ہلوں اور ٹریکٹروں میں، گھر بنانے والا، سیڑھیوں اور بیلچوں میں، کپڑا بنانے والا، کھڈیوں اور سلائی مشینوں میں پیسہ لگا سکتا ہے۔ اور یہ سب خود اپنے پیشے میں زیادہ مہارت کے حامل بن سکتے ہیں، اپنی پیداوار کا زیادہ بہتر انتظام کر سکتے ہیں، جبکہ ان کے مقابلے میں سب کچھ کر لینے والے اور خود کفیل نو آموز کبھی ایسا کرنے کی امید بھی نہیں کر سکتے۔ ہم سب محنت کی اس تقسیم کے ذریعے بہتر کوالیٹی کی اشیا، کم تر لاگت، اور پر مسرت زندگیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

لیکن یہ صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے، جب لوگوں کو سرمایہ تعمیر کرنے اور تجارت کرنے کے لیے کافی تحفظ میسر ہو، انھیں بھروسہ ہو کہ انھیں لوٹا اور دھوکہ نہیں دیا جائے گا۔ اس کا متبادل، مایوس کن ہے۔ جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا: 'جب لوگ اپنی زندگی گزارنے کے لیے کاروبار کرنا چھوڑ دیں، اور جب انھیں ہر مفید کام کو چھوڑنا پڑ جائے، تو تہذیب کا کاروبار مندے کا شکار ہو جاتا ہے، اور ہر چیز پر زوال آ جاتا ہے۔ زندہ رہنے کی کوشش میں لوگ ہر جگہ بکھر جاتے ہیں، یعنی ایسی جگہوں پر جہاں ان کی حکومت کا سکہ نہیں چلتا۔' یہ ایک ایسی چیز ہے، جو آج بالکل عیاں ہے، جیسا کہ ہم لوگوں کو غیر آزاد ملکوں سے زیادہ آزاد ملکوں کی طرف ہجرت کرتے دیکھ رہے ہیں۔

دولت تخلیق کرنا کسی کی قیمت پر نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک شخص کو جائیداد، کسی دوسرے شخص کی قیمت پر ہی مل سکتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ایک آزاد معیشت واقعتاً جائیداد کو تخلیق کرتی ہے اور موجودہ جائیداد کی قدر

میں اضافہ کرتی ہے۔

قدر، چیزوں کی طبیعی خوبی نہیں۔ یہ چیزوں کے بارے میں لوگ کی سوچ ہوتی ہے۔ بیچنے والے اپنی چیزوں کو بیچ دیتے ہیں، کیونکہ وہ ان کی نسبت گاہکوں کے نقد کو زیادہ قابلِ قدر سمجھتے ہیں۔ گاہک اپنے نقد کو چھوڑ دیتے ہیں، کیونکہ وہ جن چیزوں کو خریدتے ہیں، اور جس پیسے سے ادائیگی کرتے ہیں، اس پیسے کے مقابلے میں ان چیزوں کو قابلِ قدر سمجھتے ہیں۔ سکول کے بچے بھی ایک دوسرے کے ساتھ کھلونے تبدیل کرتے ہیں، ہر کوئی یہ دیکھتا ہے کہ جن کھلونوں سے وہ اکتا چکا ہے، ان کے بدلے کوئی اور لے کر فائدہ اٹھائے۔ ان کا یہ تبادلہ قدر پیدا کرتا ہے۔ ایسی تجارت سے کوئی بھی نقصان میں نہیں رہتا: اصل میں اگر ایک بھی فریق یہ سمجھے کہ اس لین دین سے اسے نقصان ہوگا، تو وہ یہ لین دین نہیں کرے گا۔

اسی طرح، اگر کوئی بیج بوتا ہے اور فصلیں اگاتا ہے، جبکہ پہلے کوئی یہ فصلیں نہیں اگا رہا تھا، اور دوسرے لوگ ان اشیا کو خریدنے پر راضی ہیں، تو وہ ایک ایسی چیز سے قدر پیدا کر رہے ہیں، جو کہ پہلے غیر پیداواری تھی۔ یوں دولت تخلیق ہوئی ہے، مگر کسی کو لوٹا نہیں گیا۔

اور ایک مرتبہ پھر، اگر کوئی کاروباری جوتے، یا کپڑے، یا کاریں، یا کسی نئی چیز کو بنانے کا کارخانہ لگاتا ہے، لوگ جنھیں خریدنے کے لیے راضی ہوں، اور یوں وہ اس عمل سے پیسہ کماتا ہے، تو کسے لوٹا گیا؟ یوں وہ بہت سی دولت اکٹھی کر سکتے ہیں، لیکن انھوں نے کسی سے کچھ چوری نہیں کیا۔ اس کے برعکس، انھوں نے قدر تخلیق کی اور اسے پھیلایا، جبکہ یہاں پہلے قدر موجود نہیں تھی۔

ایک آزاد معاشرہ کرونی کیپٹلزم نہیں ہوتا

کچھ لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ سرمایہ داری میں، دولت مند کارپوریٹ مفادات، غریبوں کا استحصال کرتے ہیں، اور سیاست دان اپنے کاروباری دوستوں کو اجارہ داریاں، امداد اور اعانتیں (سبسڈی) عطا کرتے ہیں۔

لیکن ایک حقیقی آزاد معاشرے میں، مقابلہ بازی، استحصال اور ''کرونی کیپٹلزم'' کو ناممکن بنا دیتی ہے۔ کاروبار اپنی بقا کے لیے گاہکوں پر انحصار کرتے ہیں۔ اگر وہ اچھی خدمت مہیا نہیں کرتے، تو گاہک انھیں چھوڑ کر دوسرے کاروبار کی طرف چلے جائیں گے۔ اور ممکنہ طور پر دوسرے کاروبار ہمیشہ موجود ہوں گے، کیونکہ ایک آزاد معاشرے میں حکومتوں کے پاس اجارہ داریاں عطا کرنے، مخصوص کمپنیوں کو تحفظ دینے، یا لوگوں کو نئے کاروبار شروع کرنے سے روکنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ ایک حقیقی طور پر آزاد معیشت، مقابلہ بازی کو جنم دیتی ہے، جو پیدا کاروں کے بجائے گاہکوں کو طاقت ور بناتی ہے: اگر کمپنیاں ایسی اشیا پیدا نہیں کرتیں، جو اس قدر کی حامل نہیں، جو لوگ اپنے پیسے کے بدلے میں چاہتے ہیں، تو ان کا کاروبار ختم ہو جائے گا۔ کچھ کمپنیاں بڑھ کر بہت بڑی بن سکتی ہیں، مثال کے طور پر، ان شعبوں میں، جیسے کہ کاروں کی تیاری، جس کے لیے بہت بڑی سرمایہ کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن انھیں پھر بھی دوسرے بڑے سرمایہ کاروں سے مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہتر کام کر سکتے ہیں۔ مسائل اس وقت سر اٹھاتے ہیں، جب حکام مقابلے کو خراب کرتے ہیں، اور نئے مقابلہ بازوں کو کاروبار میں آنے سے روکتے یا ان کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔

بلاشبہ، حقیقی طور پر کھلی مقابلہ بازی کو برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ آج دنیا کے زیادہ آزاد معاشروں میں، سیاست دان ایسے ضابطے اور قاعدے مسلط کر دیتے ہیں، جو عام طور پر غیرارادی انداز میں، مقابلہ بازی میں کمی لے آتے ہیں، اور یوں پیدا کاروں پر گاہکوں کی طاقت کو کمزور کر دیتے ہیں۔ اور پیدا کار اکثر ملی بھگت سے ایسی سازشیں تیار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، کاروبار میں جمی ہوئی کمپنیاں، سیاست دانوں کو مجبور کر سکتی ہیں کہ وہ اشیا کی کوالیٹی اور تیاری کے معیاروں سے متعلق ضابطے لاگو کریں، جو یہ بتاتے ہوں کہ کیا چیزیں تیار کی جا سکتی ہیں اور کیسے۔ وہ یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ یہ ضابطے لوگوں کو خراب اشیا سے تحفظ دینے کے لیے ہیں۔ لیکن اس کا اصل نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے نئے یا چھوٹے کاروباروں کی نسبت ان کے کاروبار کو تحفظ ملتا ہے، جو

جدت پسند طریقوں سے نت نئی اشیا پیدا کر سکتے ہیں، جن کا ذکر ضابطوں کی فہرست میں نہیں ہوتا۔ یا سیاست دان، دیوالیہ ہوتے کاروباروں کو یا ایسے کاروباروں کو، جنھیں غیر ملکی مقابلہ بازوں سے خطرہ لاحق ہو، سہارا دینے کے لیے پبلک کے پیسے کو استعمال کر سکتے ہیں، جس کے لیے وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ ملکی نوکریوں کو تحفظ دینا ضروری ہے۔ وہ ملکی صنعت کو تحفظ دینے کے لیے غیر ملکی اشیا کی درآمد پر پابندی لگا سکتے ہیں۔ یوں ان لوگوں کو عارضی فائدہ ہو سکتا ہے، جو ان صنعتوں میں کام کرتے ہیں، لیکن اس کی قیمت لوگوں اور ٹیکس دینے والوں کو ادا کرتی پڑتی ہے، جن کی انتخاب کی آزادی کم ہو جاتی ہے اور انھیں کم تر کوالیٹی کی اشیا کی زیادہ قیمت دینی پڑتی ہے۔

کوئی معاشرہ، آزادی سے جتنا زیادہ دور ہوتا جاتا ہے، اور حکام کو معاشی اختیار عطا کرتا ہے، وہاں پیدا کاروں اور سیاست دانوں کے مل کر سازش کرنے کا امکان اتنا ہی بڑھ جاتا ہے، تاکہ وہ خود اپنے فائدے کی خاطر لوگوں کا استحصال کریں۔ ایسے کرونی کیپٹلزم کے نشانات ہر جگہ مل جاتے ہیں، لیکن کم آزاد ملکوں میں یہ مسئلہ بہت زیادہ خرابی پیدا کرتا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جو اختیار حاصل کر لیتے ہیں، وہ اسے خود کو، اپنے خاندانوں اور دوستوں کو دولت مند بنانے کے لیے استعمال کریں گے۔ بلکہ جو لوگ ایسا نہیں کرتے، اسے ان کی کمزوری کا نشان سمجھا جاتا ہے۔

لیکن ایک حقیقی آزاد معاشرے میں، حکام کو اپنے ''کرونیوں'' کو مخصوص معاشی مراعات عطا کرنے کے لیے قانون سازی کے اختیار یا ٹیکس کے پیسے کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ وہاں اس سے متعلق سخت ضابطے موجود ہوتے ہیں کہ اختیار کو کیسے استعمال کرنا ہے اور یہ کہ لوگوں کا پیسہ کہاں خرچ کرنا ہے۔ پیدا کار، سبسڈی اور تحفظ حاصل کرنے کے لیے، حکام تک کامیاب رسائی حاصل نہیں کر سکتے، کیونکہ ایسی مراعات دینے کا اختیار موجود ہی نہیں ہوتا۔

کمپنیوں اور سیاست دانوں کو جو اختیار عام لوگوں کا استحصال کرنے کے قابل بناتا ہے، وہ مقابلہ بازی کا حامل کیپٹلزم نہیں، آزادی کی عدم موجودگی ہے۔

آزادی کی فتح

گو کہ معاشی آزادی اور تجارت، مکمل طور پر شاذ ہی آزاد ہوتی ہیں، لیکن پھر بھی گذشتہ 30 برسوں میں انھوں نے شاید دو بلین لوگوں کو بدترین غربت سے باہر نکال لیا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے، جسے روس، چین اور جنوب مشرقی ایشیا کی مرکزیت پر مبنی اور طاقت ور حکومتیں بھی ممکن نہیں بنا سکیں، گرچہ وہ نصف صدی سے اس کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن جیسا کہ دیواریں گری اور تجارتی رکاوٹیں دور ہوئی ہیں، زیادہ سے زیادہ ملک عالمی تجارتی نظام میں شامل ہو گئے ہیں، اور یوں دولت کو فروغ ملا ہے۔ دولت خاص طور پر غریب ترین ملکوں کے غریب ترین لوگوں تک پہنچی ہے، جنھیں بین الاقوامی تجارت کی نئی آزادی حاصل ہوئی ہے۔ تو کیا اس سیارے پر آزادی کے بجائے کوئی اور زیادہ دوستانہ اور پیداواری اصول موجود ہو سکتا ہے؟

تیسرا باب
آزاد معاشرے کے ادارے

ریاست کے بغیر معاشرہ

آزادی اور ثقافت

ایک آزاد معاشرے میں، لوگوں کی بڑی تعداد، حکومت کی غیر موجودگی میں زندہ رہتی ہے۔ یہ کوئی پرانے ہندوستانی لطیفے کا معاملہ نہیں: ''معیشت رات کے وقت بڑھتی ہے، جبکہ حکومت سو رہی ہوتی ہے۔'' بلکہ لوگوں کے لیے جو سرگرمیاں اہمیت رکھتی ہیں، ان میں سے بیشتر میں حکومت کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

ایک آزاد معاشرے میں افراد اکیلے رہنے والے افراد نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس، وہ مل جل کر رہنے والی مخلوق ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کی صحبت کے متلاشی ہوتے ہیں، دوسروں کے ساتھ جڑ کر رہنے کی کوشش کرتے ہیں، اور دوسروں کے ساتھ بہت سے طریقوں سے تعاون کرتے ہیں۔ وہ مذہبی گروہوں کے سرگرم رکن ہو سکتے ہیں۔ کلبوں اور انجمنوں میں وہ دوسروں کے ساتھ ملتے ملاتے ہیں، جو یکساں چیزوں سے لطف اٹھاتے ہیں، جن سے یہ لطف اٹھاتے ہیں، چاہے یہ گانا ہو، مطالعہ ہو، کھانا بنانا ہو، مچھلی پکڑنا ہو، کھیلنا یا کھیل دیکھنا ہو یا کوئی چیز جمع کرنا ہو۔ وہ اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ ملتے جلتے ہیں اور گروپ بناتے ہیں، خواہ یہ جوان ہوں، معمر ہوں، سکول کے دوست ہوں، نئے والدین ہوں، یا ایک جیسی معذوری کے حامل لوگ ہوں۔ وہ ضرورت مندوں اور بے گھر لوگوں کے لیے سوپ کا باورچی خانہ یا ہوسٹل چلا سکتے ہیں۔ یہی چیز ہے جسے

سول سوسائیٹی کہا جاتا ہے۔

اور عمل اور حرکت کی آزادی کے باوجود، زیادہ آزاد معاشروں کے افراد جن سے لطف اٹھاتے ہیں، ان کے شہری مشترکہ قدروں، کلچر اور روایات کو مانتے اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ آزاد افراد، خاص طور پر جوان افراد، بعض اوقات پرانے طریقوں کو چیلنج کرسکتے ہیں، اور اصل میں کام کرنے کے بہتر طریقے اسی طرح دریافت ہوتے ہیں، اور ترقی ہوتی ہے۔ مگر آزادی کلچر کی دشمن نہیں۔ یہاں تک کہ مہاجر، جن کے لیے کوئی خاص کلچر اجنبی ہوتا ہے، وہ بھی کم از کم مروج کلچر کا احترام ضرور کرتے ہیں، تاکہ انھیں معاشرے میں قبول کیا جائے۔ اگر وہ روزگار چاہتے ہیں، تو انھیں زبان سیکھنی پڑتی ہے۔ اور گو کہ وہ شروع میں جس ملک کو انھوں نے قبول کیا ہے، اس کی روایات اور اخلاقی اصولوں کو سمجھ نہ پاتے ہوں، انھیں بڑی تیزی کے ساتھ ایسا کرنا پڑتا ہے، تاکہ وہ کسی کو چوٹ پہنچانے سے بچ سکیں، اور اچھی زندگی حاصل کرسکیں۔ ایسا نہیں کہ انھیں کسی معاشرے میں امتیاز کا نشانہ بنایا جائے گا: ایک آزاد معاشرے میں ان کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن مقامی آبادی میں، یا کسی اور آبادی میں، کسی کو دوسروں کی صحبت ڈھونڈنی نہیں پڑتی، جنھیں وہ قابلِ قبول نہیں پاتے، یا جوان کے طریقوں کا احترام نہیں کرتے، یا جو ان کے ساتھ مناسب انداز میں بات چیت نہیں کرسکتے۔

انسان، دوسروں کے میل جول کے خواہش مند ہوتے ہیں، اور اس طرح مواقع حاصل کرتے ہیں، اور خود اپنے مفادات کو وسعت دیتے ہیں۔ لہٰذا، ایک اجنبی ہونا آپ کے لیے بڑا خسارہ ہوسکتا ہے۔ ایک آزاد معاشرے کے لوگ ہوسکتا ہے ایک دوسرے کی اقدار کو نہ مانتے ہوں، مگر انسانی طور پر یہ ہے کہ برداشت اور تحمل کا فائدہ ہوتا ہے۔ فکر، تقریر اور عمل کی آزادی، ایک آزاد معاشرے کے لوگ جن کے حامل ہوتے ہیں، مروج کلچر، اخلاقیات اور روایات کا لازماً احترام کرتی ہے۔

حکومت کی ضرورت کن لوگوں کو ہے؟

باہمی مفادات، تعاون، لحاظ، اعتبار، اور انحصار کا یہ غیر رسمی سلسلہ ہماری زندگیوں کو بہت تقویت دیتا ہے۔ مگر اپنے موجود ہونے کے لیے اسے حکومت کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، اور بہت سے گروہوں کے رکن ہونے کے ناطے خوشحالی پاتے ہیں، اور یہ سب کچھ حکومت کو شامل کیے بغیر ہوتا ہے۔

یہاں تک کہ قانون کے میدان میں بھی، جو کہ یہ سوچا جا سکتا ہے کہ بغیر کسی دلیل کے حکومت کا شعبہ ہے، اپنے درمیان بیشتر چیزوں کا فیصلہ ہم خود کرتے ہیں۔ ایک آزاد معاشرے میں معاہدے ریاست تیار اور مسلط نہیں کرتی، بلکہ انھیں نجی فریق تیار کرتے ہیں، جو ایسی شرائط طے کرتے ہیں، جنھیں وہ رضا کارانہ طور پر قبول کرنے پر تیار اور متفق ہوں۔ جو لوگ معاہدوں میں شامل ہوتے ہیں، اکثر وہ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ اگر ان کے درمیان کوئی تنازعے پیدا ہوتے ہیں، تو وہ آزادانہ ثالثی چاہیں گے، بجائے اس کے کہ وہ ریاستی عدالتوں میں جائیں، جہاں بہت تاخیر ہو سکتی ہے، جن پر بہت پیسہ خرچ ہو سکتا ہے، اور جو نجی متبادل کے مقابلے میں کہیں کم منصفانہ ہوتی ہیں۔

اگر خود آبادی معقول طور پر یکساں ہے، تو ایسے غیر رسمی اور تعاون پر مبنی سماجی تعلقات پیدا ہونے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اگر بیشتر لوگوں کی نسل اور مذہب ایک ہے، تو وہ ایک جیسی اقدار مانتے ہوں گے، اور ان کے لیے ایسے معاہدوں میں اعتماد کے ساتھ شامل ہونا بہت آسان ہوگا۔ نوآبادیاتی حکومتوں اور جنگ کے بعد منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنسوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، جنھوں نے روایتی سرحدوں کو دوبارہ قائم کیا اور مختلف نسلی گروہوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا۔ حال ہی میں بہت سے ملکوں کو تنازعات نے ٹکڑے ٹکڑے کیا، جیسے کہ شام، لیبیا، یا عراق، ایک صدی پہلے موجود نہیں تھے؛ انھیں سیاست دانوں نے تخلیق کیا، لوگوں نے نہیں۔ برطانویوں نے افریقہ اور برصغیر میں ایسی ہی غلطیوں کو دہرایا؛ انھوں نے مختلف قبائلی یا نسلی گروہوں کو ایک ہی انتظامی

آبادی میں اکٹھا کر دیا۔

اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ بہت سی ریاستیں غیر مستحکم ہیں، جن میں حکومتیں اپنے شہریوں کی جان و مال کی حفاظت نہیں کرسکتیں۔ یہ سخت پتھریلی زمین ہے، جہاں ایک آزاد معاشرے اور آزاد معیشت کو پھلنا پھولنا ہے۔ اگر ایک مرتبہ تعاون کے کلچر کو تباہ کر دیا جائے، تو اسے دوبارہ پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں باہمی احترام اور اعتماد کے بندھن موجود نہیں ہوتے، جن پر تعاون کی بنیاد رکھی جائے۔ ایسے میں بہترین امید یہ ہوسکتی ہے کہ مختلف گروہ اپنی اپنی آبادیاں قائم کرسکتے ہیں، جو ان کی باہمی بقا کو ممکن بناسکتی ہیں، گو کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مناسب طریقے سے تعاون نہ بھی کرتے ہوں۔ لیکن باہمی بقا اور مختلف لوگوں کے درمیان تعاون ہمیشہ بہت آسان ہو جاتا ہے، اگر ایک آزاد معاشرے کی شرائط پر عمل درآمد کیا جائے، یوں باہمی فائدے کے نتیجے کی امید پیدا ہو جاتی ہے۔

حکومتیں محدود کیوں ہونی چاہییں؟

حکومتوں کو کیا کرنا چاہیئے؟

آج کم ہی لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہماری زندگیوں کے ہر حصے پر حکومت کا کنٹرول ہونا چاہیے۔ ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ حکومت کا کردار کسی نہ کسی مفہوم میں محدود ہونا چاہیے۔ بیشتر لوگ یہ مانتے ہیں کہ ہمیں حکومت کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے تاکہ ایسی چیزوں کا فیصلہ کیا جائے یا ایسی چیزیں کی جائیں، جن کا فیصلہ یا جن پر اجتماعی طور پر عمل کرنا ہوتا ہے، مگر اسے ان چیزوں میں بالکل دخل نہیں دینا چاہیے، جنھیں ہم خود بہترین طریقے سے کرسکتے ہیں۔ اور بیشتر سوچنے سمجھنے والے لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہمارے لیڈروں پر پابندیاں ہونی چاہییں تاکہ وہ اپنے اختیارات سے تجاوز نہ کر پائیں۔

حکومت کا حجم اتنا بڑا مسئلہ نہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ حکومت کسی چیز کا فیصلہ کرتی ہے اور

کیا کرتی ہے، اور یہ کہ یہ ان چیزوں کا فیصلہ کس طرح کرتی ہے اور ان چیزوں کو کیسے کرتی ہے۔ چونکہ ایک آزاد معاشرہ اور اس کی معیشت، اعتماد پر مبنی ہوتی ہیں، آزاد معاشروں کے افراد اپنی حکومتوں سے فطری طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ انھیں دھوکے اور چوری سے تحفظ دے گی۔ لیکن ہم حکام سے یہ نہیں چاہیں گے کہ بس کا ٹکٹ بچانے پر لوگوں کو عمر قید کی سزا دی جائے، نہ ہی ہر کسی کے گھر میں جاسوسی کیمرے لگا دیے جائیں کہ کہیں وہ انٹرنیٹ سے غیر قانونی طور پر موسیقی تو ڈاؤن لوڈ نہیں کر رہے۔ حکومت کا اقدام، مسئلے کے تناسب سے ہونا چاہیے۔

حکومت کا دائرۂ کار محدود کیوں ہونا چاہیے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ افراد جو فیصلے کرتے ہیں، یعنی یہ کہ کونسی خاص شے کی تجارت کی جائے، وہ خالص طور پر رضا کارانہ ہوتے ہیں۔ مگر حکومت جو فیصلے کرتی ہے، یعنی یہ کہ لوگ کسی خاص شے کی تجارت نہ کریں، ان کے موثر ہونے کے لیے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ طاقت کا استعمال ایک برائی ہے، گو کہ بعض اوقات یہ ضروری ہوتا ہے۔ جب ہم سیاسی انداز میں فیصلے کرتے ہیں، تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان سے جو فائدے حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے طاقت کی برائی کا کتنا استعمال کرنا ہوگا، اور ان میں ایک توازن ہونا چاہیے۔ جب تک ہم نقصان کے بارے میں نہ سوچ لیں، ہمیں فائدوں کو حاصل کرنے کے لیے دوڑ نہیں لگانی چاہیے۔

اور پھلنے پھولنے کے لیے معاشی اور سماجی زندگی دونوں کو آزادی کی ضرورت ہوتی ہے۔ معاشی اور سماجی زندگی دونوں رفتہ رفتہ چھوٹے پیمانے پر کی جانے والی کوشش اور غلطی کے ایک تدریجی عمل کے ذریعے ترقی پاتی ہیں۔ ان گنت جدت کار بہت سے مختلف خیالات کو آزماتے ہیں، جیسے کہ کوئی نئی شے، یا پڑھانے کا ایک نیا طریقہ۔ جو خیالات کام نہیں دیتے، انھیں جلد ہی ترک کر دیا جاتا ہے، لیکن جو خیالات زندگی میں بہتری لاتے ہیں، دوسرے لوگ ان کی نقل کرتے ہیں اور انھیں پھیلاتے ہیں۔ مگر معاشی اور سماجی اداروں پر حکومت کا کنٹرول جدت کاروں کو کام کرنے کی آزادی نہیں دیتا: حکومت کی وجہ سے کوشش اور غلطی کا عمل حد سے زیادہ سست ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ، جب حکومتیں مداخلت کرتی ہیں، عام طور پر یہ بہت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ وہ ایک بڑی آبادی کے لیے فیصلے کرتی ہیں، جیسے کہ کیا اشیا بنائی جانی چاہییں، یا پڑھائی کے لیے کیا طریقے اختیار جانے چاہییں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جدت اور ترقی کی رفتار بہت آہستہ ہو جاتی ہے۔ اور جب حکومتیں غلطیاں کرتی ہیں، جیسا کہ وہ لازماً کرتی ہیں، تو یہ غلطیاں بہت بڑی اور خطرناک غلطیاں ہوتی ہیں۔

حکومت کی ضرورت ہی کیوں ہے؟

کچھ معقول وجوہات موجود ہیں کہ کچھ چیزیں کرنے کے لیے حکومت کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک اتھاریٹی لازماً چاہیے، جو فیصلہ کرے اور چند لازمی قاعدوں کو نافذ کرے کہ ہمیں کس طرح عمل کرنا ہے، جیسے کہ یہ فیصلہ کہ ہمیں سڑک کے کس جانب ڈرائیونگ کرنی ہے، اور اس بات کو یقینی بنانا کہ ہم جو معاہدے کرتے ہیں، ان کو پورا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ، کچھ ایسے منصوبے ہو سکتے ہیں، جو ہر کسی کے مفاد میں ہوتا ہے کہ ان پر عمل ہو، مگر امکان ہوتا ہے کہ جنھیں کوئی فرد پورا نہیں کرے گا، یا اچھے طریقے سے پورا نہیں کرے گا۔ یہ وہ چیز ہیں، جنھیں ''عوامی اشیا'' (پبلک گڈز) کہا جاتا ہے۔ دفاع اور پولیس کا کام اس کی مثالیں ہیں: جبکہ بہتر سیکیوریٹی سے ہر کسی کو فائدہ ہوتا ہے، مگر اس کام کے لیے کوئی کیوں رضا کارانہ طور پر سامنے آئے؟ ایک اور مثال ہوا کی آلودگی کی ہے، جس نے بہت سے ترقی پذیر ملکوں میں شہروں کو خراب کر دیا ہے۔ حرارت کے لیے دھوئیں سے عاری ایندھن، کاروں میں محفوظ آلات، اور فیکٹریوں کی چمنیوں پر فلٹروں کا استعمال اس مسئلے کا حل ہیں اور زندگی میں بہتری لا سکتے ہیں۔ لیکن لوگ یہ سب کام کرنے کے لیے رضا کارانہ طور پر تیار نہیں ہوں گے، جبکہ انھیں یہ پتا ہوگا کہ ان کی قربانی سے ہر کوئی مفت فائدہ، اور ان کی قیمت پر صاف ہوا کا لطف اٹھائے گا۔ لہٰذا، ہم ان معاملات کو سیاسی طور پر طے کر سکتے ہیں، اور ہر ایک کو مجبور کر سکتے ہیں کہ اپنی آلودگی پر قابو پائیں، یا ہر کسی پر ٹیکس لگا سکتے ہیں تا کہ پولیس اور سیکیوریٹی کا خرچ اٹھایا جا سکے۔ اس طرح ہم

وہ کام کر سکتے ہیں، جن کا فائدہ وسیع تر ہوتا ہے، مگر جنھیں مارکیٹ مہیا نہیں کرتی۔

آزادی کے کچھ حامی، ہم انھیں اختیار پسندوں (لبرٹیرین) کا نام دے سکتے ہیں، دلیل دیں گے کہ ہمیں حکومت کی بالکل ضرورت نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آزاد معاشرے، تعاون کے نئے سے نئے طریقے اور ہر کسی کو فائدہ پہنچانے کے طریقے ڈھونڈنے میں بے انتہا کامیاب ہوتے ہیں۔ مثلاً بھلائی کی خاطر مدد، یا ایسے نت نئے طریقے ڈھونڈنا تاکہ مفت فائدہ اٹھانے والوں کی حوصلہ شکنی کی جائے اور فائدوں کو صرف ان لوگوں تک محدود کیا جائے جو ادئیگی کرتے ہوں۔ وہ اس بات کے بھی قائل نہیں کہ ہمیں معاہدوں کو نافذ کرنے، یا ہماری زندگیوں کو حملے سے یا ہمارے مال کو چوری سے محفوظ بنانے کے لیے حکومتوں کی ضرورت ہے؛ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ افراد یا گروہ خود اپنے لیے یہ تمام کام خاصے بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔

آزاد معاشروں کے دوسرے حامی، کلاسیکی لبرل، یہ دلیل دیتے ہیں کہ کچھ سیاسی فیصلے کرنے، اور ہماری حفاظت کے لیے، معاہدوں کو نافذ کرنے کے لیے، اور کچھ عوامی اشیا مہیا کرنے کے لیے، کچھ نہ کچھ حکومتی طاقت ضروری ہے، گو کہ اسے بس ان کاموں تک محدود ہونا چاہیے۔ تاہم، لبرٹیرین اس خوف کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر آپ حکومتوں کو ایک انچ جگہ دیتے ہیں، تو وہ ایک میل تک پھیل جائیں گی: آج دنیا کی قریب قریب تمام حکومتوں نے اپنے کردار کو، لوگوں کی قیمت پر، اتنا بڑھا لیا ہے، جو اس کے بنیادی کاموں سے کہیں زیادہ ہیں۔

شخصی اور معاشی آزادی پر رائے

حکومت کا کردار کہاں تک بڑھنا چاہیے، اس کا فیصلہ ''بائیں بازو'' اور ''دائیں بازو'' کے معاملے سے طے نہیں ہوتا۔ لوگوں میں نہ صرف اس بات پر اختلاف ہوتا ہے کہ فیصلے انفرادی طور پر کیے جائیں یا اجتماعی طور پر، بلکہ اس بات پر بھی اختلاف ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق ہمارے شخصی اور معاشی فیصلوں پر بھی ہونا چاہیے یا نہیں۔

ہم اس ضمن میں چار نقطہ ہائے نظر دیکھ سکتے ہیں:

☆ پہلے گروپ کو ہم فرد پسند کہہ سکتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ اپنی ذاتی اور معاشی دونوں زندگیوں کے بارے میں فیصلے کرنے میں افراد کو آزاد ہونا چاہیے۔

☆ آمریت پسند ان کے بالکل مخالف ہیں۔ یہ ذاتی اور معاشی طرزِ عمل دونوں پر اجتماعی کنٹرول کی وکالت کرتے ہیں۔

☆ تیسرا گروپ ان لوگوں پر مشتمل ہے، جو معاشی فیصلوں میں انفرادی آزادی کی حمایت کرتے ہیں، مگر لوگوں کے ذاتی انتخاب پر اجتماعی اختیار کی حمایت کرتے ہیں۔ انھیں قدامت پسندوں کا نام دیا جا سکتا ہے (گو کہ مختلف ملکوں میں اس اصطلاح کا مطلب مختلف چیزیں ہو گا)۔ معاشی آزادی اور سماجی کنٹرول کا یہ ملغوبہ ایشیائی ملکوں کی مشترک خصوصیت ہے۔

☆ آخری گروپ میں وہ لوگ شامل ہیں، جو معاشی زندگی پر اجتماعی کنٹرول چاہتے ہیں، مگر جو افراد کو اپنی زندگیاں اپنی مرضی سے گزارنے دیں گے۔

سوال: یقیناً حکومت کو دفاع جیسی چیزیں مہیا کرنی چاہییں؟

جواب: نہیں۔ بلاشبہ کچھ چیزیں ایسی ہیں، جن کے بارے میں فیصلہ اجتماعی طور پر ہونا چاہیے، جیسے کہ جنگ کرنی ہے یا نہیں، لیکن بہت ہی کم چیزیں ہیں، جنھیں نجی طور پر مہیا نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے ملک اپنے کچھ دفاعی کام نجی کمپنیوں سے کرواتے ہیں، جو گاڑیاں، ایئر کرافٹ اور آلات بناتی ہیں، فوجیوں کی رہائش گاہیں تعمیر کرتی اور ان کی دیکھ بھال کرتی ہیں، اور خوراک اور نقل و حمل مہیا کرتی ہیں۔

یہ بہت پہلے کی بات نہیں کہ جب ہم یہ سوچتے تھے کہ ڈاک کی ترسیل، ٹیلیفون کا نظام، اور ریلوے کو صرف حکومتیں ہی چلا سکتی ہیں، اور وہی پانی، گیس اور بجلی مہیا کر سکتی ہیں، سڑکیں، ہسپتال اور جیل، یا سٹیل اور کاریں بنا سکتی ہیں۔ اب نجی فرمیں یہ سب کام کرتی ہیں۔ اور کیونکہ انھیں مقابلہ کرنا پڑتا ہے، وہ جو کوالیٹی دیتی ہیں، وہ بہت اعلیٰ ہوتی ہے۔

آخری گروپ کے لیے کوئی اچھا سا نام ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔ ریاست ہائے متحدہ میں انھیں لبرل کہا جاتا ہے، مگر یہ لفظ کا بہت گمراہ کن استعمال ہے۔ بہت سے دوسرے ملکوں میں، لبرل کا مطلب کلاسیکی لبرل ہے؛ یعنی یہ تصور کہ حکومتی قاعدوں کا کچھ نہ کچھ ڈھانچہ ضروری ہے، مگر بیشتر معاشی اور ذاتی فیصلے افراد پر چھوڑ دیے جانے چاہییں۔ عملاً اس اصطلاح کو امریکی سیاست دانوں اور دانش وروں نے چوری کرلیا ہے، جو شخصی آزادی پر یقین رکھتے ہیں، مگر جو چاہتے ہیں کہ حکومت معاشی زندگی پر زیادہ کنٹرول رکھے۔

یہ تمام یک لفظی بیانات ان چیزوں کو بیان کرنے کے غیر درست طریقے ہیں، جو حقیقت میں معاشی اور سماجی معاملات کے بارے میں نظریات کا ایک سپیکٹرم ہیں۔ ہر گروپ میں بہت سے مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ (مثال کے طور پر فرد پسندوں میں ایسے لبرٹیرین شامل ہیں، جو مکمل آزادی کی دلیل دیں گے، اور کلاسیکی لبرل بھی ہیں، جن کے نزدیک حکومت کا کردار محدود ہونا چاہیے۔ جبکہ آمریت پسندوں میں مطلق العنانیت کے حامی بھی ہیں، جو مکمل کنٹرول کی وکالت کرتے ہیں، اور ان میں ریاست پسند بھی شامل ہیں، جو نجی فیصلہ سازی کے کردار کو محدود دیکھنا چاہتے ہیں۔)

مگر اس بات سے باخبر ہونا ضروری ہے کہ سیاسی نظریات کو بائیں بازو- دائیں بازو کے سادہ سپیکٹرم پر مناسب طریقے سے بیان نہیں کیا جا سکتا، جو معاشرے کے بارے میں قطعاً مختلف نظریات کے حامل لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیتا ہے۔ اس کے بارے میں یوں سوچنا زیادہ مفید ہے کہ لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ زندگی کے دو مختلف حصوں، معاشی اور ذاتی میں کتنی آزادی ہونی چاہیے۔

انفرادی انتخاب کی آزادی کیوں ہونی چاہیے؟

معاشی اور ذاتی دونوں زندگیوں میں آزادی کو ترجیح دینے کے لیے ٹھوس وجوہات موجود ہیں۔ آغاز کی غرض سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ لوگوں کو خود اپنی ضروریات کا بہت بہتر علم ہوتا ہے، جتنا ایک دور دراز حکومت کے پاس کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ خود اپنی امیدوں، خوف، خوابوں،

خواہشوں، ضرورتوں اور آدرشوں کا احساس رکھتے ہیں۔ وہ خود اپنے حالات، اور اپنے دوستوں، گھرانوں اور آبادیوں کے حالات سے بھی بہت زیادہ واقف ہوتے ہیں، جن کے درمیان وہ خوش رہتے ہیں اور جن سے مدد چاہتے ہیں۔ وہ ان مواقع سے بہت بہتر واقف ہوتے ہیں، جو انھیں میسر ہوتے ہیں، انھیں پتا ہوتا ہے کہ ان کے کس اقدام سے کیا مسائل پیدا ہوں گے۔ لہٰذا، اپنی زندگیوں اور مستقبل سے متعلق فیصلے کرنے کے بارے میں وہ خود بہترین پوزیشن میں ہوتے ہیں۔

اس میں اخلاقی نکتہ بھی موجود ہے کہ وہ لوگ جن کے فیصلے ان کے لیے کیے جاتے ہیں، وہ مکمل انسان نہیں، بلکہ محض غلام ہیں۔ اور چونکہ جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی ذاتی ذمے داری ان پر نہیں ہوتی، لہٰذا، وہ اپنی کامیابیوں اور غلطیوں سے کبھی کچھ نہیں سیکھتے۔ وہ حکام کی بری پالیسیوں کے برے نتائج بھگت سکتے ہیں، مگر اسے دوبارہ واقع ہونے سے روکنے کے لیے بہت کم کچھ کر سکتے ہیں، اور اسی لیے انھیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ کیوں کوشش کریں۔ مگر ایسے افراد جو اپنی کامیابیوں کے فائدوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اور اپنی غلطیوں کا خمیازہ بھگتتے ہیں، ان میں یہ محرک بہت طاقت ور ہوتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو دہرائیں، جو فائدہ دیتی ہیں، اور ان چیزوں سے بچیں، جو فائدہ نہیں دیتیں۔

تنوع ترقی کو بڑھاتا ہے

تنوع یا گونا گونی میں فائدہ بھی ہے۔ ایسے لوگ جو اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہوتے ہیں، وہ بہت مختلف طریقوں سے عمل کریں گے۔ وہ ایسے اقدام چنیں گے، جنھیں وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے حالات کے مطابق درست ہوں گے۔ وہ زندگی کے مختلف طرزِ حیات آزما سکتے ہیں، یعنی ''زندگی کے ساتھ تجربات''، جیسا کہ انگریزی فلسفی جان سٹوارٹ مل نے 1859ء کے اپنے مضمون، ''آزادی کے بارے میں'' میں لکھا تھا۔ ان میں کچھ کامیاب ہو سکتے ہیں، دوسرے نہیں۔ لیکن ہم سب ان سے سیکھ سکتے ہیں، اور خود اپنی ترقی کو بڑھاوا دے سکتے ہیں، اس کام کو زیادہ کر

کے، جس کا فائدہ ہوتا ہے، اور اس کام پر کم عمل کرکے، جس سے فائدہ نہیں ہوتا۔

اس کے مقابلے میں، ایک آمرانہ معاشرے میں، کام کرنے کا صرف ایک طریقہ مروج ہوتا ہے، کیونکہ فیصلے اجتماعی طور پر کیے جاتے ہیں۔ جو بھی غلطیاں ہوتی ہیں، ان کے نتائج سب کے لیے تباہ کن ہوتے ہیں۔ اور اگر سرکاری اندازِ نظر کامیاب ہوتا ہے، تو ہمیں دوسری چیزیں کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی، ہوسکتا ہے جو کہیں زیادہ بہتر ثابت ہوں۔ فیصلہ سازی نہایت آہستہ اور افسر شاہانہ ہوتی ہے۔ ایسی دنیا میں ہماری ترقی آہستہ ہوگی اور اکثر تکلیف دہ بھی۔

ایک آزاد معیشت میں پیداکاروں کو اپنے گاہکوں کی رائے مسلسل ملتی رہتی ہے۔ ہر روز ہر لمحے، لوگ ان اشیا کا انتخاب کرتے ہیں، جنھیں وہ دوسری اشیا پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہر شے، جو وہ خریدتے ہیں، اس کی قیمت، پائیداری، سائز، شکل، رنگ اور دوسری بہت سی خوبیوں کو جانچتے ہیں۔ یہ مختلف قسم کی ترجیحات پل بھر میں پیداکاروں تک پہنچتی ہیں، جنھیں یوں پتا چلتا ہے کہ کیا چیز بِک رہی ہے، اور کیا چیز نہیں بِک رہی۔ ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ دوسرے مقابلہ کرنے والے بھی ایسا کررہے ہیں، لہٰذا، رسدکار لوگوں کی پسند کی اشیا تیزی سے پیدا کرسکتے ہیں، اور ناپسند کی جانے والی اشیا کی پیداوار کم کرسکتے ہیں۔ اور اس طرح انھیں تحریک بھی ملے گی کہ وہ نئی اور مختلف اشیا متعارف کروانے کا تجربہ کریں گے، جو انھیں امید ہوگی کہ گاہک کہیں زیادہ پسند کریں گے۔

اس طرح کی معیشت کا موازنہ اس معیشت سے کریں، جہاں حکام یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا کیا کچھ پیدا کیا جائے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پوری معیشت پر ان کا کنٹرول ہے، یا اس کے کچھ حصوں پر، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے: یہ فیصلہ سازی کہ کیا کچھ پیدا کیا جائے اور کیسے پیدا کیا جائے، ایک سست اور بھونڈا کام ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہر کچھ برس بعد، انتخابات میں گاہک اپنی ترجیحات کا اظہار کرسکتے ہیں۔ مگر وہ انفرادی اشیا اور ان کی خوبیوں کے بارے میں

ووٹ نہیں دیتے: فرض کریں انھیں کبھی حقیقی انتخاب کرنے کا موقع مل بھی جاتا ہے، تو انھیں پالیسیوں کے ایک پورے پیکیج کے بارے میں ووٹ دینا ہوگا، جس میں دفاع، سکولنگ اور حفظانِ صحت سے لے کر آبپاشی، زراعت اور دیہی ٹرانسپورٹ شامل ہوں گے۔ پھر یہ کہ حکام کو مستقل فیڈ بیک نہیں ملے گی، اور انھیں اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں، جو مارکیٹ معیشت میں گاہک اپنے رسد کاروں کو مہیا کرتے ہیں۔ حکام پر کوئی دباؤ نہیں ہوگا کہ وہ جدت لائیں، اور گاہکوں کو وہ کچھ نہیں ملتا، جو وہ حقیقتاً چاہتے ہیں۔

مداخلت کے نقصان دہ اثرات

آج دنیا میں چند ہی ایسے ملک ہیں، جہاں حکومت، قوم کی تمام پیداوار کا بندوبست کرتی ہو، یا ایسا کرنے کی کوشش کرتی ہو۔ زیادہ عام یہ بات ہے کہ حکومت کچھ مخصوص شعبوں پر کنٹرول رکھتی ہے، خاص طور پر ایسے شعبے جنھیں لازم سمجھا جاتا ہے، جیسے کہ حفظانِ صحت، تعلیم، زراعت یا پولیس، یا پھر عام طور پر وہ پیداوار کا بندوبست سبسڈی (اعانت)، قیمتوں پر روک اور کاروبار سے متعلق ضابطوں کے ذریعے کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ جب حکومتیں چند شعبوں کو بھی چلانے کی کوشش کرتی ہیں، سستی اور بھونڈے پن کا مسئلہ موجود رہتا ہے، خاص طور پر جہاں یہ شعبے نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مثلاً حکومت خوراک کی پیداوار کا بندوبست کر سکتی ہے، مگر اگر یہ خوراک کی کافی مقدار پیدا کرنے میں ناکام رہتی ہے، جس کی لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے، تو نتیجہ بڑے قحط کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

اسی طرح، پیداوار کے بندوبست کی حکومتی کوششیں، عام طور پر رسد اور طلب کے درمیان فرق پیدا کر سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر، سیاست دان یہ کوشش کر سکتے ہیں کہ وہ چند اشیا یا خدمات کی قیمتوں پر روک لگا کر ان کی قیمت کو کم رکھیں، جیسے کہ خوراک، یا حفظانِ صحت، کی قیمتیں، یا شرح سود۔ لیکن اس طرح، چیزیں مہیا کرنے سے پیدا کاروں کی کمائی کم ہو جاتی ہے۔

انھیں جو قیمت ملتی ہے، وہ انھیں پیداوار پر جتنا خرچ کرنا پڑتا ہے، اس کا جواز نہیں بن پاتی۔ لہٰذا، وہ پیداوار کم کردیتے ہیں، یا اس شعبے کو ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

اس کا نتیجہ چیزوں کی کمیابی یا کمی ہے۔ جب قانون کے ذریعے چیزوں کی قیمتوں کو مصنوعی طور پر کم رکھا جائے ،تو پیداکار رسد کم کردیں گے، جبکہ صارف زیادہ خریدنے کا تقاضا کریں گے۔ خوراک سرکاری طور پر سستی ہوسکتی ہے، لیکن یہ دکانوں میں نایاب ہوسکتی ہے۔ شرحِ سود کم ہوسکتی ہے، مگر قرضے ڈھونڈ نا ممکن نہیں رہتا۔ حفظانِ صحت مفت ہوسکتا ہے، مگر اس کے لیے آپ کو قطاروں میں لگنا پڑتا ہے۔

جب حکومت سبسڈی کے ذریعے مخصوص اشیا یا خدمات کی پیداوار کو کنٹرول کرتی ہے، ایسے ہی مسائل جنم لیتے ہیں۔ مثلاً یورپی یونین بہت عرصے سے اپنے زرعی شعبے کو سبسڈی اور تحفظ دیتی ہے، غرض یہ ہوتی ہے کہ یوں خوراک کی یقینی اور مسلسل رسد جاری رہے گی، لیکن حقیقت میں ہوتا یہ ہے کہ وہ نااہل یورپی کسانوں کو بین الاقوامی مقابلے میں تحفظ مہیا کرتی ہے (اور یوں سیاسی طور پر اس اہم گروہ کی حمایت حاصل کرتی ہے)۔ سبسڈی ضرورت سے بہت زیادہ پیداوار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، اور یوں غیر ضروری مکھن کے پہاڑ اور نہ بکنے والے مشروب کی جھیلیں پیدا کرتی ہے۔

مگر ان کے علاوہ دوسرے نتیجے بھی ہیں، ان کے مقابلے میں جن پر نظر کم پڑتی ہے۔ یورپ کی زرعی سبسڈی سے جنھیں سب سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے، وہ بڑے زمیندار ہیں، غریب کسان نہیں۔ اور بدعنوانی بھی عروج پر رہی ہے، اور کسان اس خوراک کے لیے بھی سبسڈی مانگتے رہے ہیں، جو انھوں نے کبھی پیدا ہی نہیں کی۔ دنیا بھر میں ایسی لاتعداد کہانیاں ملتی ہیں، اور تاریخ میں بھی موجود ہیں: اپنی 1776ء کی کتاب، ''دولتِ اقوام'' میں سکاٹ معیشت دان، ایڈم سمتھ نے شکوہ کیا ہے کہ مچھلی پکڑنے والی کشتیوں کو یوں تیار کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی سبسڈی کو زیادہ سے زیادہ بڑھا سکیں، زیادہ سے زیادہ مچھلی پکڑنے کے لیے نہیں۔

پیداوار کی جس بھی صورت کو سبسڈی دی جائے گی، وہ وسائل کو ان شعبوں کے بجائے، اپنے شعبے کی طرف کھینچنے لگے گی، جہاں وقت، کوشش اور سرمائے کو زیادہ بہتر انداز میں کام میں لایا جاسکتا ہے۔ مثلاً بہت سی حکومتیں حالیہ طور پر مہنگی ہوائی اور شمسی توانائی کو سبسڈی دے رہی ہیں، جس کے لیے وہ افراد اور کاروباروں کا پیسہ لے رہی ہیں، جس کی کم لاگت والے کاموں اور طریقوں میں سرمایہ کاری کی جاسکتی ہے۔ اس سے معاشی افزائش سست ہوتی ہے، اور لوگوں کی طویل مدتی خوشحالی کو دھچکا لگتا ہے۔

چند لوگوں کا فیصلہ

حکام کے بجائے، افراد خود فیصلہ کریں، اس بات کو ترجیح دینے کے حق میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یوں جو انتخاب کیے جاتے ہیں، وہ چند طاقت ور لوگوں کے بجائے بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ ضروری ہے کہ حکام ہر کسی کے لیے جو فیصلے کریں، ان فیصلوں پر عمل درآمد کے لیے انھیں طاقت کی ضرورت بھی ہوگی۔ لیکن حکام بھی تو انسان ہی ہیں؛ اور وہ اس لالچ سے بچ نہیں پائیں گے کہ وہ اس طاقت کو خود اپنے اور اپنے خاندانوں یا اپنے دوستوں یا اپنے ہمسائیوں یا اپنے قبیلے یا اپنی سیاسی جماعت کے مفادات کو بڑھانے کے لیے استعمال کریں۔ وہ کنٹریکٹ اور اجارہ داریاں اپنے شرکا کو مہیا کرتے ہیں۔ سرکاری اخراجات کا ایک غیر متناسب حصہ سینئر سیاست دانوں کے آبائی ضلعوں کو ملتا ہے۔ حکومتی، پولیس اور عدالتوں کی نوکریاں، قابلیت کی بنیاد پر ملنے کے بجائے پسندیدہ لوگوں کو ملتی ہیں۔

لیکن جتنی کم چیزوں کا فیصلہ سیاسی طور پر کیا جائے گا، اور جتنی زیادہ چیزوں کا فیصلہ لوگ خود کریں گے، کسی بھی قسم کی کرپشن کا امکان اتنا ہی کم ہو جائے گا۔ حکومت اپنے اولین کام پر توجہ دے سکتی ہے، یعنی یہ تشدد کو کم سے کم کرے، بجائے اس کے یہ اس سے مستفید ہو۔

بعض اوقات نفع اندوزی کو دیکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ 'لوگوں کی جیبوں سے پیسے کھینچنے کے علاوہ ایسا کوئی فن نہیں، جسے ایک حکومت کسی دوسرے حکومت سے سیکھنے میں دیر لگائے۔'

یہ بات معاشیات کے بانی مبانی، ایڈم سمتھ نے کہی تھی۔ مثلاً حکومتیں قرض لے کر منصوبوں پر خرچ کر سکتی ہیں، اور یوں انتخابات میں جیت سکتی ہیں، اور اپنے حامیوں میں اضافہ کر سکتی ہیں، جبکہ اس کی لاگت کی ادائیگی دوسروں کو کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ یہ لاگت دوسری نسل کو بھی منتقل کی جا سکتی ہے۔ اگر ان کا قرضہ بہت زیادہ ہو جائے، وہ نوٹ چھاپ سکتے ہیں اور یوں کرنسی کی قدر میں کمی کر کے اپنے قرض خواہوں کو ادائیگی کر سکتے ہیں۔ مگر ایسی چوری، خواہ یہ ظاہر ہو یا چھپی ہوئی، دولت جوڑنے کے ضمن میں لوگوں کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔ وہ نئے کاروبار شروع کرنے سے ہچکچاتے ہیں، اور پیداواری سرمایہ جمع نہیں کرتے، اور یوں پورے معاشرے کی حالت خراب ہونے لگتی ہے۔

حقیقتاً ایک آزاد معاشرے کی حکومت کو قرض لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی، مگر اس استثنیٰ کے ساتھ کہ حالات نہایت نازک ہوں، مگر ایسا بھی بہت کم ہو گا۔ نہ ہی اس حکومت کی کرنسی پر اجارہ داری ہو گی، اور نہ ہی جب اسے ضرورت ہو گی، یہ مزید کرنسی چھاپ سکے گی۔ اور ایک آزاد معاشرے میں ٹیکسوں کی شرح کم ہو گی اور ان کا نفاذ وسیع تر بنیاد پر کیا جائے گا، اور یہ سیاسی مخالفوں یا اقلیتوں، جیسے کہ دولت مند لوگوں پر عائد نہیں کیے جائیں گے۔ ٹیکس سادہ، شفاف ہوں گے، اور ان کی ادائیگی آسان اور قابلِ پیش بین ہو گی۔ انھیں سرکاری یا نجی ایجینسیوں کے حوالے نہیں کیا جائے گا، جن کی دلچسپی اس بات میں ہوتی ہے کہ ٹیکس دینے والوں سے جتنا پیسہ کھینچا جا سکتا ہے، کھینچا جائے۔

پدرانہ دلیل

حکمران اشرافیہ میں ایک یہ نقطۂ نظر بہت عام ہے کہ انھیں تمام فیصلے کرنے پڑتے ہیں، کیونکہ لوگ، بچوں کی طرح ہیں، جو خود اپنے فیصلے کرنے کے قابل نہیں۔ یہ بات خود تضاد کا شکار ہے: یہ ان لوگوں کو نیچے گرا دیتی ہے، جن کی حمایت سے وہ طاقت میں آتے ہیں۔ اور یہ کہنا غیر منطقی ہے کہ لوگ ایک درست حکومت کو منتخب کرنے کے لیے کافی اجتماعی دانائی کے حامل ہیں، مگر وہ خود اپنی زندگیاں گزارنے کے لیے کافی انفرادی دانائی کے حامل نہیں۔

یقیناً ایسی صورتیں موجود ہیں، جہاں پورے معاشرے کو فائدہ ہوگا، اگر لوگوں کا طرزِ عمل ذرا بہتر ہو جائے۔ مگر ان میں سے اکثر اخلاقی معاملات ہیں، جن کا نفاذ قانون کا کام نہیں۔ اور گو کہ ہم لوگوں سے یہ درخواست کرسکتے ہیں کہ وہ چیزیں اخلاقی طور پر کریں کیونکہ یوں دوسروں کی مدد ہوگی، مگر ایک آزاد معاشرے کی حکومت لوگوں کو ایسا کرنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔ اسے اختیار صرف اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ دوسروں کو جو نقصان پہنچایا جاتا ہے اس کا تدارک کرے، بجائے اس کے کہ لوگوں کو دوسروں کو فائدہ پہنچانے پر مجبور کرے۔ 'عوامی اشیا' کی دلیل لوگوں کو مجبور کرنے کی بات کرتی ہے تا کہ وہ دفاع جیسے کچھ مشترک منصوبوں کے لیے ادائیگی کریں، لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔

یہ درست ہے کہ لوگ اکثر ایسے معاملات پر بے حسی دکھاتے ہیں، جیسا کہ ریاستی خدمات کس طرح مہیا کی جاتی ہیں۔ لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ کچھ بھی تبدیل نہیں ہوگا۔ اگر لوگوں کے شامل ہونے سے کسی چیز میں بہتری آتی ہو، تو زیادہ لوگ ایسا کریں گے۔

سوال: بلاشبہ، حکومت کی طرف سے ہم سب پر ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں؟

جواب: نہیں۔ ایک آزاد معاشرے میں، لوگوں کی طرف سے حکومت پر ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ بہت سی جگہوں پر حکومتیں قائم ہوئیں، اور باقی رہیں، مگر طاقت کے ذریعے۔ یہ حکومت کی جائز قسم نہیں۔ ایک آزاد معاشرے کی حکومت ایک ایسی حکومت ہوتی ہے، جسے لوگ ایک ایسی ایجنسی کے طور پر قائم کرتے ہیں، تا کہ وہ چند ایک ایسی چیزوں سے متعلق فیصلہ کرے یا یہ چیزیں کرے، جنھیں اجتماعی طور پر کرنا ہوتا ہے یا جن سے متعلق فیصلہ اجتماعی طور پر کرنا ہوتا ہے (جیسا کہ دفاع)، یا جنھیں غیر جانبداری سے کرنا ہوتا ہے یا جن سے متعلق فیصلہ غیر جانبداری سے کرنا ہوتا ہے (جیسا کہ انصاف)۔ اس کا کام شہریوں کی خدمت ہوتا ہے، نہ شہریوں کا کام اس کی خدمت ہو۔

حکومت کو محدود کرنے کے طریقے

جمہوریت

ایسا کم ہی ہوتا ہے جہاں اجتماعی فیصلوں سے مفر ممکن نہ ہو، اور ایک آزاد معاشرہ پوری آبادی سے مشورہ لیتا ہے، کیونکہ اس کا نتیجہ پوری آبادی کو متاثر کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، یہ ایک قسم کی جمہوریت ہے۔

ایسا نہیں ہوتا کہ پوری آبادی ہر فیصلہ کرتی ہو، کیونکہ یہ بہت مشکل ہے اور اس پر بہت وقت لگے گا۔ عام طور پر پوری آبادی اپنے نمائندے منتخب کرتی ہے تاکہ وہ ان کی طرف سے فیصلے کریں۔ ایسے نمائندے محض مندوبین کی حیثیت نہیں رکھتے، اور جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ ان کے غلاموں کی طرح رائے دیں، جنھوں نے انھیں منتخب کیا ہے، وہ اس عمل میں اپنی رائے بھی شامل کرتے ہیں۔

جمہوریت، عوام پسندی (پاپولزم) کی طرح نہیں۔ لوگوں کی اکثریت یہ یقین رکھ سکتی ہے کہ مذہبی یا نسلی اقلیت کو تہہِ تیغ کر دیا جائے، مگر ایک آزاد معاشرے کی حکومت ایسا نہیں کر سکتی۔ اس کا وجود ہی اس بات تقاضا کرتا ہے کہ یہ دوسروں کو نقصان نہ پہنچنے دے، نہ کہ اس کو سہولت مہیا کرے۔ ایک پرانا لطیفہ جمہوریت کو دو بھیڑیے اور ایک بکری قرار دیتا ہے، جنھیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ رات کے کھانے میں کیا کھایا جائے۔ لیکن ایک آزاد معاشرے میں اکثریت کے اختیارات پر پابندیاں ہوتی ہیں تاکہ اقلیتوں کو تحفظ دیا جائے۔

بڑا مسئلہ یہ نہیں کہ حکومتوں کا انتخاب کیسے کیا جائے، بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انھیں پابند کیسے بنایا جائے۔ یہ بھی انسان ہوتی ہیں: انھیں جو اختیار ملتا ہے، وہ انھیں کرپٹ بنا دیتا ہے۔ اگر آزادی کی حفاظت کرنی ہے، تو ایک ایسا میکانزم ضروری ہے جس کی مدد سے لیڈروں کو ہٹایا جا سکے۔ ایک آزاد معاشرے میں انتخابات کا مطلب لیڈروں کا چناؤ نہیں، بلکہ ان سے نجات بھی ہے۔

چند آمریت پسند یہ دلیل دیتے ہیں کہ انتخابات غیر استحکام پیدا کرتے ہیں، کیونکہ مختلف

حکومتیں بالکل مختلف پالیسیوں کے حامل ہوتی ہیں اور کبھی ووٹر انھیں لاتے ہیں اور کبھی نکالتے ہیں۔ لیکن چونکہ ایک آزاد معاشرے میں حکومت کا اختیار محدود ہوتا ہے، یوں غیر استحکام کا امکان بھی کم ہو جاتا ہے۔ اگر حکومتوں کو جائز سمجھا جاتا ہے، تو غیر استحکام کے امکانات زیادہ کے بجائے کم تر ہو جاتے ہیں۔ اگر انھیں جائز نہ سمجھا جائے، تو ایسا نہیں ہوتا۔ اگرچہ اسلحے کی طاقت سے ایک ناجائز حکومت بہت عرصے تک قائم رہ سکتی ہے، مگر اس کے حقیقی متبادل مخصوص عرصے کے بعد پُرامن انتخابات ہیں، یا پھر اب یا تب خونی انقلابات۔ آزاد معاشروں میں انتخابات کو ترجیح دی جاتی ہے، جو جبر وتشدد کو محدود کرتے ہیں، اور تبدیلی اور ترقی کو تیزی کے ساتھ واقع ہونے دیتے ہیں۔

اگر انتخابات کو جائز کی حیثیت سے قبول کرنا ہے، تو کچھ شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً جماعتوں کے درمیان حقیقی انتخاب دستیاب ہونا چاہیے۔ یہ آزاد انتخاب نہیں ہوگا، اگر ووٹ دینے کے لیے صرف ایک امیدوار ہو: ایک آزاد معاشرے میں ہمیشہ بہت سے مختلف اور متنوع نظریات موجود ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مختلف امیدوار اس قابل ہوں کہ وہ اپنے نظریات کا اظہار کر سکیں اور انھیں شائع کر سکیں، اور دوسرے امیدواروں اور جماعتوں پر تنقید کر سکیں۔ اور لوگ اس قابل ہوں کہ وہ اپنی پسند کے امیدواروں کو ووٹ دے سکیں، بغیر جوابی انتقام کے خوف کے، یعنی بیلٹ خفیہ ہونا چاہیے۔ کچھ ملک دولت مند امیدواروں پر انتخابی مہم میں کیے جانے والے اخراجات کی حد قائم کرتے ہیں، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ دولت مند امیدوار یا جماعتیں فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ بیشتر ملکوں میں حکومت کی مدت مقرر ہوتی ہے، بجائے اس کے کہ آنے والی حکومت یہ فیصلہ کرے کہ انتخابات کب ہوں گے۔

سرکاری فیصلہ سازی

غیر آزاد ملکوں میں زیادہ تر حکومتیں طاقت کے ذریعے اقتدار میں آتی ہیں۔ ان میں سے بعض طاقت کے ذریعے ہی اقتدار میں رہتی ہیں، جبکہ بہت سی حکومتیں خود کو جائز کہلوانے کے

لیے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ لیتی ہیں، جیسے کہ وہ خود کو ثقافتی ورثے کا واحد محافظ قرار دے لیتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں، ایک آزاد معاشرے میں حکومت کے مقاصد بہت محدود ہوتے ہیں اور یہ لوگوں کی مرضی سے موجود ہوتی ہے۔

اس کے باوجود، حکومتیں اکثر ان مقاصد سے بھٹک جاتی ہیں، جن کے لیے وہ قائم ہوتی ہیں، یعنی کسی کو نقصان نہ پہنچے اور وہ اجتماعی کام کرنے کے لیے، جنھیں انفرادی طور پر نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً عام طور پر وہ عوامی اشیا کی فراہمی پر اجارہ داری قائم کر لیتی ہیں۔ گو کہ اس بات سے متعلق فیصلے کہ کیا عوامی اشیا مہیا کی جائیں، اجتماعی طور پر کیے جا سکتے ہیں، جبکہ ان اشیا کو جزوی یا کلی طور پر نجی ایجنسیوں کے ذریعے فراہم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً فلاحی تنظیمیں غریبوں اور بیماروں کی دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔ اور دوسروں کو پہنچنے والے نقصان، جیسے کہ آلودگی کے اثرات سے پہنچنے والے نقصان کا اندازہ لگانا مشکل ہو سکتا ہے، سو حقیقتاً حکومتی مداخلت کو پورے طور پر بلا جواز کہا جا سکتا ہے۔

اگر کچھ فیصلوں کو اجتماعی طور پر کیا جانا ضروری ہے، تو ان فیصلوں کو کرنے کے لیے کیا قاعدے بنانے چاہییں؟ متفقہ فیصلوں کی بات تو مثالی ہوگی: فیصلہ سازی میں ہر کوئی حصہ لیتا ہے، اور کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا، جب تک کہ ہر کوئی متفق نہیں ہو جاتا۔ کچھ لوگ امکان ہے کہ اجتماعی اقدام کے لیے ووٹ نہیں دیں گے، جو وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے نقصان دہ ہوگا، تو یوں اجتماعی فیصلوں کے ذریعے افراد یا گروہوں کو نقصان پہنچنے کا امکان کم رہ جائے گا۔

مگر سو فیصد اتفاق بہت مشکل ہے۔ ہر شخص کے لیے اتنا وقت نکالنا مشکل ہوگا کہ وہ ہر تجویز کو پڑھے اور اس پر ووٹ دے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بجائے نمائندے چنے جاتے ہیں۔ اور اتفاق کا حصول بڑی تگ و دو چاہے گا، کیونکہ ایک شخص پورے منصوبے کو مسترد کر سکتا ہے۔ لہٰذا، عام طور پر اجتماعی فیصلے عام انتخابات، ریفرینڈم یا مجلس قانون ساز کے ذریعے اکثریت کی مدد سے کیے جاتے ہیں۔ یہ سادہ اکثریت (50 فیصد+1)، یا مشروط اکثریت (جیسے کہ تین چوتھائی)۔

یوں فیصلوں تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے، جبکہ یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ اقلیتی اشرافی گروہوں کے بجائے، فیصلے آبادی کے ایک بڑے حصے کی مدد سے کیے گئے ہیں۔

ووٹروں کا ذاتی مفاد

ایک رومن شہنشاہ کے بارے میں ایک کہانی مشہور ہے، جسے گائیکی کے مقابلے میں جیتنے والوں کا فیصلہ کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے ایک کو سنا اور انعام دوسرے کو دے دیا، کہ دوسرا گانے والا پہلے سے برا نہیں ہوسکتا۔ اور آج، لوگوں میں یہ سوچنے کا رجحان موجود ہے کہ جب بھی ہم ایک آزاد معاشرہ اور آزاد معیشت جو کچھ پیدا کرتی ہیں، اس سے غیر مطمئن ہوں، تو حکومتی اقدام کو اس میں بہتری لانی چاہیے۔ مثلاً اگر مارکیٹ عوامی اشیا، جیسے کہ دفاع یا بہبود کی فراہمی میں ناکام ہوتی ہے، تو اس کے بجائے حکومت کو انھیں فراہم کرنا چاہیے۔ یا اگر کوئی کارخانہ ہوا کو آلودہ کرتا ہے، تو اسے روکنے کے لیے حکومتی اقدام درکار ہے۔ مگر اس سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔

بعض موقعوں پر مارکیٹ ہماری ضرورتیں پوری کرنے میں ناکام ہوسکتی ہے۔ مگر جب ہم 'مارکیٹ کی ناکامی' کی بات کرتے ہیں، تو ہمیں حکومتی ناکامی کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔ قدرے آزاد معاشروں میں بھی، حکومتیں بے غرض، نپی تلی، غیر جذباتی، عوامی روح سے سرشار نہیں ہوتیں۔ حکومت کے اندر اوپر سے نیچے تک ذاتی مفاد موجود ہوتا ہے۔

لوگ انتخابات کو اس بات کے جاننے کا ایک ذریعہ خیال کرتے ہیں کہ عوامی مفاد کیا ہے اور اس پر کیسے عمل درآمد کیا جائے۔ لیکن ایک آزاد معاشرے میں بہت سے مختلف مفادات موجود ہوتے ہیں، اور ان مفادات میں تصادم ہوتا ہے۔ ایسے ووٹر جو ٹیکسوں کی کم شرح چاہتے ہیں، ان کی ان ووٹروں کے ساتھ نہیں بنتی، جو لوگوں کے لیے زیادہ اخراجات چاہتے ہیں۔ وہ لوگ جو ایک نئی شاہراہ سے فائدہ اٹھائیں گے، ان لوگوں کی مخالفت کرتے ہیں، جن کے گھر مسمار ہو جائیں گے۔ انتخابات مفادِ عامہ کا تعین نہیں کرتے۔ یہ مقابلہ کرنے والے مختلف مفادات میں

توازن قائم کرتے ہیں۔تصادم کی اس بنیاد پر اجتماعی فیصلے کیے جاتے ہیں۔

سیاست دانوں کا ذاتی مفاد

جیسے ووٹر چاہتے ہیں کہ ان کے مفاد پورا ہو، اسی طرح سیاست دان بھی یہی چاہتے ہیں۔ بہت سے کوئی عہدہ اس لیے چاہتے ہیں کہ یوں وہ دولت مند ہو سکتے ہیں یا اپنے دشمنوں کو نیچا دکھا سکتے ہیں۔اگر وہ اپنے عہدے سے فائدے نہیں اٹھاتے ،تو انھیں کمزور سمجھا جا سکتا ہے۔ اور زیادہ آزاد معاشروں میں بھی کرپشن ایک مسئلہ بن سکتی ہے۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سیاست دان عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں،تو پہلے انھیں اقتدار میں آنا ہوگا۔انھیں جیتنے کے لیے کافی ووٹ درکار ہوں گے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس غرض سے انھیں وسیع تر رائے عامہ کے بارے میں سوچنا ہوگا۔وہ کم تعداد، غیر نمائندہ اقلیتوں کو اپیل کر کے زیادہ ووٹ حاصل کر سکتے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے گروہ ،جن کے مفادات بہت مضبوط ہوتے ہیں، سیاسی عمل پر حاوی ہوتے ہیں، کیونکہ انھوں نے کوئی مخصوص چیز جیسے کہ اپنی پسندیدہ پالیسی حاصل کرنی ہوتی ہے، جیسے کہ اپنی صنعت کے لیے سبسڈی۔ چھوٹے اور زیادہ متحرک ہونے کی وجہ سے، وہ آسانی سے منظّم ہو جاتے ہیں، اور اپنی مہم چلانے اور لابی کرنے کی خاطر زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ زیادہ بڑے گروہ، جیسے کہ صارفین یا ٹیکس دینے والے، جن کے نظریات مخصوص نہیں ہوتے ،ان کا منظّم ہونا مشکل ہوتا ہے۔اور وہ متحرک بھی کم ہوتے ہیں، کیونکہ جیسے کہ سبسڈی کی پالیسیوں پر جو لاگت آتی ہے، ہر کسی کو اس کا بہت کم حصہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

مفاداتی گروہ اور سودے بازی

اقلیتی نظریات اس وقت زیادہ حاوی ہو جاتے ہیں، جب مفاداتی گروہ دوسروں کے ساتھ معاہدہ کر کے اپنے ووٹوں کی طاقت بڑھا لیتے ہیں۔ بہت سے گروہوں کا اتحاد، جو کسی امیدوار کو چھوڑ دینے کی دھمکی دے رہے ہوں، اس امیدوار کے لیے کسی تنہا امیدوار سے کہیں

زیادہ وزن رکھتا ہے۔

قانون ساز مجلس یا مقنّنہ میں بھی مفادات کا یہی کھیل کھیلا جاتا ہے۔ وہ سیاست دان جو خود اپنے حلقوں کے لیے منصوبوں پر زیادہ سرکاری اخراجات چاہتے ہیں، دوسروں کے ساتھ سودے بازی کرتے ہیں، جو اپنے ضلعوں میں دوسرے منصوبے چاہتے ہیں۔ لیکن اس بندوبست کا کہ تم میرے اقدام کو ووٹ دو، میں تمہارے اقدام کو ووٹ دوں گا، جسے ''لاگ رولنگ'' ('سودے بازی') کہا جاتا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسی زیادہ تجاویز کامیاب ہو جاتی ہیں اور یوں حکومت کا سائز بھی بڑھ جاتا ہے، اس سے بھی کہیں زیادہ جتنا کوئی حقیقتاً چاہتا ہو۔

اور جب ان قوانین پر عمل درآمد ہوتا ہے، تو ذاتی مفاد اور زیادہ کھل کھیلتا ہے۔ وہ اہل کار جنھیں انتظام کرنے کا کام ملتا ہے، وہ خود اپنے مفادات کا خیال کریں گے۔ ان کی حیثیت اور تنخواہ جزوی طور پر زیادہ سٹاف پر منحصر ہوتی ہے، اور شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ بیوروکریسی کے پروسیس کو زیادہ پیچیدہ بنا سکتے ہیں، تا کہ اتنے زیادہ سٹاف کا جواز پیش کیا جا سکے؛ اس عمل کو ''مملکت کی تعمیر'' (ایمپائر بلڈنگ) کا نام دیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہ عام لوگوں کے بجائے، چھوٹے مفاداتی گروہ، ان کے ساتھ زیادہ لابی کریں گے، یوں انھیں خصوصی مفادات کو زیادہ حصہ دینا ہوگا، اور شاید وہ ان سے رشوت بھی لیں گے۔

قاعدوں کی تشکیل

حاصل یہ کہ حکومتوں کے انتخاب، قوانین بنانے اور قوانین کا نفاذ کرنے میں ٹھوس مفادات کی حامل اقلیتیں ان اکثریتوں کی نسبت زیادہ اہم ہوتی ہیں، جن کے نظریات منتشر ہوتے ہیں۔ سیاسی طور پر کیے گئے فیصلے لوگوں کے وسیع تر نظریات کو کم ہی خاطر میں لاتے ہیں۔ اور حکومتی شعبے میں اس حد سے آگے بڑھنے کا رجحان موجود ہوتا ہے، جہاں تک بیشتر لوگ اسے دیکھنا چاہتے ہیں، اور جہاں تک یہ معقول معلوم ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی آگے جہاں تک ایک آزاد معاشرے کے بندوبست کے لیے ضروری ہوتا ہے، بلکہ اس نقطے تک جہاں آ کر آزادی

واقعتاً گھٹنے لگتی ہے۔

زیادہ آزاد معاشرے ان مسائل کو حد میں رکھنے کے لیے مختلف قاعدے تشکیل دیتے ہیں۔ انتخابات اس کا بہت اہم حصہ ہیں۔ مگر یہ سیاست دانوں اور سرکاری اہل کاروں پر کمزور پابندیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کبھی کبھی منعقد ہوتے ہیں، اور بڑی جماعتیں ان پر چھائی رہتی ہیں، اور یوں تبدیلی سست ہو جاتی ہے۔ زیادہ سخت پابندیوں کی ضرورت ہے۔

آئینی پابندیاں

سیاسی عمل کو پابند بنانے کا ایک عام طریقہ آئین کو اختیار کرنا ہے، جس پر ہر کوئی، یا بھاری اکثریت متفق ہو، اور جو ایسے قاعدے تشکیل دیتا ہو، جن کی مدد سے انتخابات منعقد اور فیصلے کیے جاتے ہیں۔ اگر قاعدوں سے متعلق ہر کسی کا اتفاق کرنا ضروری ہو، حکومتوں کے لیے ان قاعدوں کا نفاذ مشکل ہو جاتا ہے، جو خود ان کے فائدے کے لیے بنائے جاتے ہیں، مثلاً حزبِ اختلاف کے امیدواروں پر پابندی لگانا یا حزبِ اختلاف کے ووٹروں پر غیر متناسب ٹیکس عائد کرنا۔

سیاسی عمل پر مزید پابندی اختیارات کی علاحدگی کے ذریعے لگائی جاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ کوئی واحد شخص یا کوئی ایک واحد مجلس قانون سازی کے اختیار کی حامل ہو، تصور یہ ہے کہ اس اختیار کو مختلف اداروں میں بانٹ دیا جائے، جن میں سے ہر ایک اس چیز کو روک، تبدیل یا پابند کر سکتا ہے، جسے دوسرا کر سکتا ہو۔ اسی لیے بعض اوقات اس نظام کو ''چیکس اینڈ بیلنسز'' کا نظام کہا جاتا ہے۔

اگر کُل اختیار کسی ایک مجلس، جیسے کہ پولٹ بیورو یا قانون ساز کونسل کے پاس ہو، تو یقیناً سیاسی اکثریتیں اور مختلف گروہی مفادات خود اپنے فائدے کے لیے انھیں اپنے قابو میں لانا چاہیں گے۔ لیکن اگر آئین اختیار کو دو مختلف حکومتی ایوانوں میں تقسیم کرتا ہے، تو مفاداتی گروہوں کے لیے ان پر قبضہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر ان دونوں ایوانوں کا انتخاب مختلف طریقے سے ہوتا ہے، تو کسی ایک گروہ کے لیے دونوں ایوانوں پر حاوی ہونا اور زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ اگر ایک

ایوان کوئی فیصلہ کرتا ہے، جسے دوسرا ایوان روک سکتا یا تبدیل کر سکتا ہے، تو یوں سودے بازی (لاگ رولنگ) اور اقلیتوں کا استحصال اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

چیکس اور بیلنسز کے اس نظام میں ایک اہم مقام کی حیثیت سے زیادہ آزاد معاشروں کے بیشتر آئین ایک صدر کا تقرر بھی کرتے ہیں، جو تمام لوگوں کا نمائندہ ہوتا ہے، جو (یہ امید کی جاتی ہے) سیاسی تنازعے سے بلند ہو سکتا اور اقلیتوں کے لیے نقصان دہ قانون سازی کو ویٹو کر سکتا ہے۔

اس استحصال کے خلاف ایک اور روک، آزاد عدلیہ ہے۔ یہ آزاد معاشرے کے لیے لازم ہے۔ ججوں کی سیاسی وابستگی نہیں ہونی چاہیے، اور انھیں غیر آئینی قوانین اور اقلیتوں کے استحصال کو ختم کرنے کے قابل ہونا چاہیے، اور یہ کہ انھیں یہ سب کچھ سیاست دانوں کی طرف سے کسی انتقام کے خوف کے بغیر کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔

آئین بعض اوقات حکومتوں کی سرگرمیوں پر دوسری پابندیاں عائد کرتے ہیں، جیسے کہ متوازن بجٹ، یعنی یہ اصرار کہ ان کے بجٹ ایک مقررہ عرصے (جیسے کہ تین یا پانچ برس) پر متوازن ہوں، اور سالانہ قرضوں اور کل سرکاری قرضے کی حدوں کا تعین۔ بعض تو یہ پابندی بھی لگاتے ہیں کہ حکومت قومی آمدنی کا کتنا حصہ خرچ کر سکتی ہے، تاکہ بڑھوتری کے اس کے پیدائشی رجحان کو روکا جا سکے۔ اس کے علاوہ، مدت کا تعین ہوتا ہے تاکہ سیاست دان برسوں عہدوں سے نہ چمٹے رہیں، اور ''محدود مدتی (Sunset) دفعات'' کا تعین، تاکہ حکومتی ادارے جب تک مفید ہوں اس سے زیادہ عرصے تک موجود نہ رہیں۔

اقلیتوں کی حفاظت کا ایک اور طریقہ ''مشروط اکثریت کی ووٹنگ'' ہے۔ مثال کے طور پر، اگر حکمران اکثریت مقننہ میں آئینی قاعدوں کو سادہ اکثریت کی مدد سے تبدیل کرنے کے قابل ہو، تو آزادی بہت غیر یقینی ہو جائے گی۔ لہٰذا، ایک آزاد معاشرہ بہت اونچی رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے، جیسے کہ دونوں ایوانوں میں دو تہائی ووٹ اور ساتھ ہی ساتھ یکساں طور پر انفرادی خطوں یا ریاستوں میں رائے شماری میں اتنی ہی بلند شرح۔

ایسے معاملات جن کے ضمن میں اقلیتوں کا استحصال نہایت نقصان دہ انداز میں کرنا آسان ہو، فیصلوں کے لیے بہت زیادہ اکثریت درکار ہونی چاہیے۔ مثلاً، ایسے ٹیکس تشکیل دینا آسان ہے، جو خاص گروہوں پر بہت زیادہ بوجھ ڈالتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک آزاد معاشرے کی وکالت کرنے والے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ٹیکس سے متعلق (یہ نہیں کہ ٹیکس کی شرح کیا ہو، بلکہ یہ کہ کون کتنا ٹیکس ادا کرے) قاعدوں کا فیصلہ متفقہ طور پر ہونا چاہیے، تاکہ اقلیت کا تحفظ ہو سکے، گو کہ اکثریت کتنی ہی بھاری کیوں نہ ہو۔

مجبور لوگ

ایک مارکیٹ معیشت میں، اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کوئی تاجر آپ کو دھوکہ دے رہا ہے، اور آپ کو آپ کے پیسے کی کم تر قدر دے رہا ہے، تو آپ اپنے کاروبار کو کہیں بھی لے جانے میں آزاد ہوتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کی حکومت آپ کو دھوکہ دے رہی ہو یا آپ کا استحصال کر رہی ہو، آپ کہیں بھی نہیں جا سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ ملک چھوڑ دیں، لیکن زبان اور دوسری رکاوٹوں کے پیشِ نظر بیشتر لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں۔ یہ جبر کا نسخہ ہے، جو اس چیز کو اور زیادہ اہم بنا دیتا ہے کہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ حکومت کا کردار اور اقدام، اور ان کا ہر ایک حصہ، احتیاط کے ساتھ بیان کیا جائے، اور سختی کے ساتھ ان لوگوں تک محدود کیا جائے، جن کا کام آبادی کی آزادی کو محفوظ رکھنا اور اسے توسیع دینا ہے۔

چوتھا باب

برابری اور نابرابری

آزاد معاشرے میں نابرابری

بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ آزاد معاشروں میں بہت نابرابری ہوگی ۔ کیونکہ وہ لوگوں کو خوب دولت کمانے اور جمع کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یوں بہت زیادہ معاشی نابرابری پیدا ہوگی ۔

لیکن یہ دلیل غلط ہے ۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، آزاد اور غیر آزاد معاشروں کے درمیان آمدنیوں کا فرق قریب قریب ایک جیسا ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ زیادہ آزاد معاشرے قدرے زیادہ برابر ہیں۔

مزید یہ کہ غیر آزاد معاشروں میں دوسری ، غیر مالیاتی نابرابریاں پائی جاتی ہیں، جو زیادہ آزاد معاشروں میں نہیں پائی جاتیں۔ آزاد معاشرے کا ہر شہری ایک بہتر نوکری کر کے، یا کاروباری سرگرمیوں میں شامل ہوکر اپنی دولت اور آمدنی میں اضافے کی خواہش کرسکتا ہے، جن سے انھیں فائدہ ہوگا۔ غیر آزاد معاشروں میں یہ چیز ہمیشہ ممکن نہیں ہوتی ۔ حکومت کی نوکریاں صرف ان لوگوں کو مل سکتی ہیں، جو حکمران جماعت کے حامی ہوں، یا جو حکمرانوں کے دوست اور شریک ہوں ۔ قانون ، یا تعصب، عورتوں ، یا نسلی اقلیتوں یا دوسرے گروہوں کو مخصوص شعبوں میں کام سے روک سکتا ہے۔ کسی خاص نسل یا ذات کے لوگوں کو کسی نہایت کمتر کام تک محدود کیا جاسکتا ہے۔ مہاجروں (Immigrants) کو کاروبار شروع کرنے اور ان کے مالک بننے سے، یا بینک

میں اکاونٹ تک کھولنے سے روکا جا سکتا ہے۔

ان لوگوں میں بھی، جنھیں کام مل جاتا ہے، نابرابری قائم رہتی ہے۔ مثلاً سوویٹ ماسکو کے ریڈ سکوائر میں گم (جی یو ایم) ڈیپارٹمینٹ سٹور صرف ان سیاحوں کے لیے تھا، جن کے پاس قیمتی کرنسی ہو یا پھر پارٹی کے سینیئر عہدیداروں کے لیے تھا۔ یہ پارٹی کے سینیئر عہدیدار تھے، جو ''ذِل'' لیموزین کی سواری کر سکتے تھے، ان کی سہولت کے لیے ٹریفک کو روک دیا جاتا تھا، یا یہ وہی تھے جو پرفضا صحت مند مقامات پر ہوٹل میں مہینہ بھر چھٹیاں گزار سکتے تھے۔ اپارٹمنیٹ یا دیہی مکان، حکام الاٹ کرتے تھے، جو اپنے دوستوں کو اچھے مکان الاٹ کرتے تھے۔

یہ تمام ایسی نابرابریاں ہیں، جن سے بچنا ممکن نہیں: جو لوگ انھیں برداشت کرتے ہیں، ہوسکتا ہے انھیں ووٹ کا حق ہی نہ ہو یا وہ اس قانون مین تبدیلی کے لیے کوئی مہم بھی نہ چلا سکیں۔ اس کے مقابلے میں ایک آزاد معاشرے میں سارے رکن کم ازکم ایک اچھے نوکری کی، یا اپنا کاروبار شروع کرنے، اور دولت اور آمدنی حاصل کرنے کی امید رکھ سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ سب کے سب کامیاب نہ ہوں، مگر وہاں انھیں روکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

نابرابری کی قسمیں

ایک آزاد معاشرے میں برابری کا مطلب ہر کسی کو ایک جیسی دولت یا آمدنی یا ایک جیسا طرزِ حیات دینا نہیں۔ یہ اس بات کو یقینی بنانے کا نام ہے کہ لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔

اس کی چار اہم صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک آزاد معاشرے کے شہری اخلاقی برابری کے حامل ہوتے ہیں: ہر کوئی ایک جیسا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے لیے خود انتخاب کرے اور دوسرے اس کے ساتھ لحاظ اور عزت کے ساتھ پیش آئیں۔ پھر قانون کی نظر میں برابری ہوتی ہے: قانون انھیں تحفظ دیتا ہے اور ہر کسی کے ساتھ یکساں طریقے سے پیش آتا ہے، قطع نظر اس سے کہ ان کی نسل، مذہب، جنس، دولت یا خاندان کیسا ہے۔ وہ سیاسی برابری کے حامل ہوتے ہیں: وہ سب

ووٹ دے سکتے ہیں اور خود سیاسی عہدے کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اور وہ موقعے کی برابری کے حامل ہوتے ہیں: کام یا سکول یا ذاتی ترقی کی راہ میں کوئی بے بنیاد رکاوٹیں حائل نہیں ہوتیں۔

اخلاقی برابری

ایک آزاد معاشرے میں، لوگوں کو یکساں طور پر لحاظ اور عزت کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر کسی کو اپنی زندگیوں کے بارے میں انتخاب کا حق حاصل ہوتا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ اس عمل میں دوسروں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

یہ نظریہ انسانوں کی فطرت کے بارے میں ایک گہرے یقین پر مبنی ہے، وہ فطرت جو ہم سب میں ایک جیسی ہے۔ نسل، مذہب، یا جنس سے قطع نظر، ہم سب اپنے انتخاب خود کرنا چاہتے ہیں، اور ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ ہمارے اس حق کا احترام کریں۔ ایک آزاد معاشرے میں اصول یہ ہے، ''ویسا کریں، جیسا آپ چاہتے ہیں آپ کے ساتھ کیا جائے۔''

اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ اپنے اعمال میں یکساں طور پر اخلاقی ہیں۔ جو دوسروں پر حملہ کرتے یا انھیں لوٹتے ہیں، ان کا یہ عمل اخلاقی نہیں۔ کچھ لوگ جان بوجھ کر سماجی اور جنسی رواجوں کو مسترد کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگیوں کی قدر باقی رہتی ہے۔ ان کا قانون کو توڑنا یا غیر اخلاقی کام انھیں سزا یا تنبیہ کا مستوجب بناتا ہے، جو ان کے جرم کے تناسب کے حساب سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھیں بے بنیاد یا حد سے زیادہ ظلم اور بے عزتی کا نشانہ بنایا جائے۔

قانون کی نظر میں برابری

ایک آزاد معاشرے میں قانون لوگوں کو غیر جانبداری کے ساتھ تحفظ اور سزا دیتا ہے۔ مجرموں کی کسی ذاتی خصوصیت، جیسے کہ دولت مندی، یا اثر ورسوخ، ذات، جنس، مذہب یا نسل کی وجہ سے پولیس، عدالتیں یا جیل حکام ان کے ساتھ مختلف طرح کا سلوک نہیں کرتے۔ شہریوں کو بغیر کسی وجہ کے گرفتار یا ہراساں نہیں کیا جا سکتا، صرف اس وجہ سے کہ با اختیار لوگ انھیں پسند نہیں

کرتے ۔ ہر کسی کو انصاف کے یکساں حصول میسر ہوتا ہے، اگر کوئی دوسرا اسے نقصان پہنچائے یا لوٹے، قطع نظر اس سے کہ جس پر الزام عائد ہوتا ہے، وہ کون ہے اور قطع نظر اس سے کے وہ کتنا ممتاز ہے۔

دنیا کی عدالتوں کی عمارتوں پر ایک مجسمہ نصب ہوتا ہے، انصاف کے اس بت کے ایک ہاتھ میں ترازو ہوتا ہے اور دوسرے میں تلوار۔ لیکن اس کی اہم بات یہ ہے کہ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے ۔ ایک آزاد معاشرے میں انصاف ہر چیز کے ضمن میں اندھا ہوتا ہے، سوائے معاملے کے حقائق کے ضمن میں ۔

سیاسی برابری

ایک اور طرح کی برابری جو بطور انسان لوگوں کی فطرت سے پیدا ہوتی ہے، وہ سیاسی برابری ہے۔ ہر کسی کے مفادات اور رائے، غور کے قابل سمجھی جاتی ہے۔ یوں ایک آزاد معاشرے میں انتخابات یا رائے شماری میں ہر کوئی ووٹ کا حق رکھتا ہے، اور کوئی بھی شخص ایک سے زیادہ ووٹ کا حق نہیں رکھتا۔ اس سے یہ بات یقینی بنتی ہے کہ امیدوار اور منتخب سیاست دان ہر کسی کے مفادات کو خاطر میں لاتے ہیں۔

اس معاملے میں بہت کم استثنیٰ ہیں۔ ہم عام طور پر بچوں کو ووٹ دینے کی اجازت نہیں دیتے، کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ابھی اتنے بالغ نہیں کہ ان پر اور دوسروں پر حکومت کیسے کی جائے اس پر اپنی سوچی سمجھی رائے دے سکیں۔ اسی طرح، ایسے لوگوں کو بھی ووٹ دینے سے نکال دیا جاتا ہے، جو شدید ذہنی معذوری کا شکار ہوتے ہیں: لیکن اس کمی کو آزادانہ طور پر پرکھا جانا چاہیے تاکہ حکمران اشرافیہ اپنے مخالفوں کو اس بنیاد پر روک نہ سکے۔

اس بارے میں مختلف رائیں موجود ہیں کہ آیا سزا یافتہ مجرموں کو ووٹ کی اجازت دی جانی چاہیے۔ کچھ ملکوں میں، جو لوگ جیلوں میں ہوتے ہیں، وہ اپنا ووٹ کا حق کھو دیتے ہیں، اس بنیاد پر کہ جس نے سنگین انداز میں قوانین کو توڑا ہے، اسے قانون سازی کے عمل میں شامل نہیں کیا

جانا چاہیے۔ کچھ دوسرے ملکوں میں، صرف ان لوگوں کو ووٹ دینے سے روکا جاتا ہے، جو انتہائی سنگین جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کچھ اور ملکوں میں مجرموں کو ووٹ کے حق کا حامل سمجھا جاتا ہے، اس فطرت کی وجہ سے جو ہم سب میں مشترک ہے۔

سیاسی برابری کے اصول کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں بھی ووٹ کا اتنا ہی حق رکھتی ہیں، جتنا مرد، گو کہ نسبتاً آزاد معاشروں میں یہ اس حق کو ابھی کوئی نصف صدی قبل تسلیم کیا گیا ہے۔ نیوزی لینڈ پہلا ملک تھا، جس نے 1893ء میں بالغ عورتوں کو ووٹ کا حق دیا۔ آسٹریلیا میں یہ حق 1902ء میں دیا گیا، گرچہ مقامی عورتوں پر ووٹ نہ دینے کی پابندی 1962ء تک موجود رہی۔ بیشتر یورپی ملکوں نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد ووٹ کی اجازت دے دی تھی، جبکہ یہ چیز فرانس میں 1944ء میں اور سوئیٹزرلینڈ میں 1971ء میں ممکن ہوئی۔

ووٹ کے حق سے متعلق جو بھی استثنیٰ ہوں، انھیں سختی کے ساتھ محدود ہونا چاہیے۔ غیر آزاد ملکوں میں حکام کے لیے اپنے دشمنوں کو ووٹ سے روکنے کے لیے جیل میں ڈال دینا، یا انھیں ذہنی طور پر مفلوج قرار دے دینا، یا اور بہت سے مختلف بہانوں کا سہارا لینا نہایت آسان ہوتا ہے۔ یہ اختیار کا غلط استعمال ہے۔

جہاں تک قابلِ عمل ہو، ہر شخص کے ووٹ کو یکساں گنا جانا چاہیے۔ مثلاً، ہر انتخابی حلقے میں، جہاں سے نمائندوں کو منتخب کیا جانا ہے، ووٹروں کی تعداد قریب قریب برابر ہونی چاہیے۔ زیادہ بڑے حلقے ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ نتائج میں ہر ووٹر کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ بہت مختلف سائز کے حلقے بنانے کا صرف ایک سبب جغرافیائی حقیقتیں ہو سکتی ہیں۔ انتخابی حد بندی کا فیصلہ آزاد تنظیموں کو کرنا چاہیے، تاکہ انھیں حکمران گروہوں کے فائدے میں توڑا مروڑا نہ جا سکے۔

ووٹ کے حق کے ساتھ، ہر کسی کو یہ حق بھی یکساں حاصل ہے کہ وہ خود انتخاب میں کھڑا ہو اور عہدیدار بنے۔ قانون ساز مجلس میں ایسی نشستیں نہیں ہونی چاہییں، جو کسی مخصوص جنس، نسل یا مذہب کے لوگوں کے لیے محدود ہوں۔ انتخابی نظام کو اس برابری کو لازماً تحفظ دینا چاہیے، تاکہ

مثال کے طور پر، خاص طور پر حکمران سیاسی حکام کی طرف سے کسی خطرے یا دھمکی کے خوف کے بغیر ہر کوئی کسی بھی عہدے کے لیے کھڑا ہو سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں اپنی مہم چلانے، تقریر کرنے، اپنے نظریات اور دوسرے امیدواروں، قوانین اور آئین کے بارے میں اپنی تنقید کو شائع کرنے، اور نشر کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ انتخابات کا مقصد ہے خیالات کا ایک مقابلہ، اور کوئی انتخابات آزادانہ نہیں ہو سکتے، اگر خیالات اور آزاد تقریر کو دبا دیا جائے۔ کچھ غیر آزاد ملکوں میں، حکومت پر تنقید کرنا مجرمانہ فعل ہوتا ہے۔ زیادہ آزاد معاشروں میں، ایسی تنقید روزمرہ سیاسی بحثوں کا بالکل نارمل حصہ ہوتی ہے۔

موقعے کی برابری

موقعے کی برابری کا مطلب ہے کہ افراد اپنے جو مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، تعلیم، کام، یا زندگی کے دوسرے میدانوں میں، ان کے راستے میں کوئی بے بنیاد رکاوٹیں حائل نہیں ہونی چاہییں۔ مثلاً اگر وہ کسی سکول یا کسی سپورٹس کی ٹیم میں جانا چاہتے ہیں، تو ان کی نسل رکاوٹ نہیں بننی چاہیے۔ ان کی سیاست یا جنس کا مطلب کسی نوکری کے چانس کے لیے انکار نہیں ہونا چاہیے۔ نہ ہی ان کی غربت یا سماجی حیثیت کسی کے ساتھ شادی میں رکاوٹ بنے، جس کے حالات ان سے مختلف ہوں۔

تاہم، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی تعلیمی قابلیت سے قطع نظر، سکولوں یا آجروں کو ہر کسی کو قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ ایک سکول اپنے داخلوں کو ایک امتحان پاس کرنے والوں تک محدود کر سکتا ہے، اور ایک آجر حوالوں اور تجربے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ ایک آزاد عورت ضروری نہیں کہ اس آدمی سے شادی کر لے کیونکہ اس کا دل اس پر آ گیا ہے۔ موقعے کی برابری کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی راہ میں بے بنیاد رکاوٹیں نہ کھڑی کی جائیں، اور انھیں وہ کچھ کرنے پر مجبور نہ کیا جائے، جو وہ نہیں کرنا چاہتے۔ مثلاً، بعض ثقافتوں میں طے کی جانے والی شادیاں عام ہیں، اور ایک آزاد معاشرے میں بھی قابل قبول ہوتی ہیں، شرط یہ ہے کہ دونوں فریق راضی ہوں۔ مگر

لوگوں کو ان کی خواہش کے خلاف شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، چاہے ان کے والدین ایسا کیوں نہ چاہتے ہوں۔ ایک آزاد معاشرے میں، جو بھی شادی کی عمر کو پہنچتا ہے، اسے اپنے لیے خود فیصلہ کرنے کے قابل بھی سمجھا جاتا ہے۔ کسی دوسرے معاہدے کی طرح، اگر کسی ایک فریق کو بھی مجبور کیا جائے، تو شادی غیر موثر ہو جاتی ہے۔

اگرچہ اپنی زندگی کے انتخابات میں لوگوں کے لیے کوئی رکاوٹیں حائل نہیں ہونی چاہییں، مگر فطری نابرابریاں موجود ہوتی ہیں۔ کوئی شخص جو بہرا پیدا ہوتا ہے، غیر ممکن ہے کہ وہ کمپوزر یا آرکیسٹرا کا کنڈکٹر بن جائے (گو کہ اپنی بعد کی زندگی میں بیتھوویں نے اس پر قابو پا لیا تھا)۔ ہاتھ پاؤں سے معذور شخص پہاڑوں پر چڑھنے کی آرزو نہیں کر سکتا۔ اور بچوں کو زندگی کی ابتدا میں مختلف قسم کے حالات ملتے ہیں، جو خاندان پر منحصر ہوتے ہیں: ایک کے والدین انھیں کتابیں خرید کر دے سکتے ہیں اور سکول کے کام میں ان کی مدد کر سکتے ہیں، جبکہ ایک اور بچے کے والدین ان سے بے توجہی برت سکتے ہیں۔

سوال: کیا غریب لوگ لیموزین خریدنے میں آزاد ہیں؟ حقیقتاً آزاد ہیں؟

جواب: ہاں، وہ آزاد ہیں۔ ایک آزاد معاشرے میں ہر کوئی آزاد ہے کہ وہ تعیّشات کی اشیا خریدے، گو کہ چند ایک ہی انھیں خریدنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ یہ سوال اختیار کا ہے، آزادی کا نہیں؛ زیادہ غریب لوگ قوتِ خرید کے حامل نہیں ہوتے کہ وہ ایک بڑی کار خرید سکیں؛ مگر کوئی شخص یا کوئی حکومتی ادارہ انھیں روکتا نہیں۔ ہر کوئی تعیّشات کی خواہش پوری کر سکتا ہے، وہ محنت کر کے کمائے، بچائے یا پھر ادھار لے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کے امیر ترین اور زیادہ آزاد معاشروں میں حتیٰ کہ زیادہ غریب لوگ بھی اب ان چیزوں کا مزا اٹھاتے ہیں، جیسے کہ گھر کو گرم رکھنا، روشنی، بجلی اور پانی، جو چند دہائیاں پہلے تعیّشات میں شمار ہوتی تھیں۔ اس کے مقابلے میں، غیر آزاد معاشروں میں، لوگ بڑے گھر یا زرخیز زرعی زمین کی خواہش نہیں کر سکتے، بشرطیکہ حکام انھیں یہ چیزیں عطا کریں۔

مغرب کے بعض لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے، بچوں کو زندگی کی ابتدا میں مختلف حالات ملتے ہیں، سکولوں کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا ہونا چاہیے کہ جب وہ بلوغت کی عمر پہنچیں اور نوکری کرنے لگیں، تو وہ ایک جیسی حیثیت کے مالک ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ سکول معالجاتی تعلیم پر بہت وسائل خرچتے ہیں، اور ذہین ترین بچوں کو اپنے بہترین امکانات کو حاصل کرنے کے بجائے انھیں ہموار کر کے سب کے برابر کر دیتے ہیں۔ مگر حقیت یہ ہے کہ جو فطری فرق ہیں، ہم ان کی تلافی نہیں کر سکتے، اور سماجی فرق کی تلافی کے لیے جو چیز ہے، وہ ایک بھیانک خواب ہے کہ ریاست بچوں کو ان کی پیدائش کے وقت والدین سے اپنی تحویل میں لے لے اور یکساں انداز میں ان کی پرورش کرے۔

مثبت امتیاز

کچھ ملکوں نے مثبت امتیاز کی مدد سے فطری فرق کی تلافی کرنے، اور تعصّبات کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اقلیتوں تک پہنچا جاتا ہے، جن کا یہ خیال ہوتا ہے کہ کچھ مواقع انھیں میسر نہیں، جیسے کہ ذہین مگر غریب بچے، جو کبھی کسی اعلیٰ یونیورسیٹی میں درخواست دینے کے بارے میں سوچتے بھی نہیں، اور ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ کوشش تو کریں۔ ایسی رسائی اور حوصلہ افزائی پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس طرح ان گروہوں کو جو موقعے دستیاب ہوتے ہیں، ان میں اضافہ ہوتا ہے۔

مگر مثبت امتیاز کا مطلب یہ نکل سکتا ہے کہ اقلیتی گروہوں کو ترجیح دی جانے لگتی ہے، جیسے کہ سکولوں اور آجروں پر کوٹہ مسلط کیا جاتا ہے تا کہ انھیں اقلیتی امیدواروں کو قبول کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔ اس کا فائدہ ہو سکتا ہے، مگر ایک حد تک۔ دلیل یہ ہے کہ مثبت امتیاز نے ریاست ہائے متحدہ میں 1960ء کی دہائی سے سیاہ فاموں کو یہ اجازت دی کہ وہ سکولوں اور کام کی جگہوں میں اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کریں، اور یوں ان کے خلاف گوروں کے تعصب کو ختم ہونے میں مدد ملی۔ مگر مثبت امتیاز ایک آزاد معاشرے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ گو کہ یہ تعصب کو ختم کرنے میں

مدد کر سکتا ہے اور یوں آزادی کے فروغ میں مدد دیتا ہے، مگر یہ مخصوص گروہوں کو مراعات عطا کرتا ہے، بجائے اس کے ان کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔

بعض لوگ ترجیحات اور کوٹے کے حق میں دلیل دیتے ہیں اور اقلیتوں کے ساتھ ماضی میں ہونے والے منفی امتیاز کو اس کی بنیاد بناتے ہیں۔ مگر جو گزر گیا وہ گزر گیا: آج کچھ لوگوں کے حق میں مثبت امتیاز سے ماضی میں اسی اقلیت کے دوسرے لوگوں کے ساتھ جو ناانصافی کی گئی، اس کا ازالہ نہیں ہوتا، جنھیں ماضی میں نقصان پہنچایا گیا۔ اور اس پالیسی کو جہاں تک اکثریت کا تعلق ہے اس کے لیے نامنصفانہ ہی سمجھا جا سکتا ہے، جن کے لیے یہ ضروری ہو جائے گا کہ وہ اسی سکول اور نوکری کے مواقع تک پہنچنے کے لیے بہت اعلیٰ میعار حاصل کریں۔ یوں اقلیت کو ایک نیا مراعت یافتہ طبقے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، اور اس پالیسی یا ان اقلیتوں کے خلاف ناپسندیدگی کا ردِعمل یا تشدد سامنے آ سکتا ہے، جنھیں اس سے فائدہ ہوتا ہے۔

منفی امتیاز

بلاشبہ، امتیاز کا مقصد ہمیشہ اقلیتوں کی مدد نہیں ہوتا۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اکثریت خود کو ووٹ دے کر مراعات اور ترجیحات کا حامل بناتی ہے، جو اقلیتی گروہوں کو میسر نہیں ہوتے۔ ملائیشیا اور جنوبی افریقہ دو نمایاں مثالیں ہیں، لیکن دنیا میں ایسی صورتیں کثرت سے موجود ہیں، جن میں قانون اقلیتی آبادیوں کے ساتھ ان کی نسل، مذہب، زبان، جنسی ترجیحات اور سیاسی تصورات کی بنیاد پر امتیاز برتتا ہے۔

ایک آزاد معاشرے میں ایسے امتیاز کے لیے کوئی جگہ نہیں: ایک آزاد معاشرے میں لوگ قانون کی نظر میں برابر ہوتے ہیں، اور کوئی گروہ خود کو ووٹ کے ذریعے خصوصی مراعات عطا نہیں کر سکتا۔ اکثر صورتوں میں یہ امتیاز اقلیتی آبادیوں کی ایذا رسانی میں بدل جاتا ہے۔ کیونکہ انھیں وہ حقوق دستیاب نہیں ہوتے، اکثریت جن کی حامل ہوتی ہے، اقلیت کے پاس اپنی حالت سدھارنے کا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا۔ وہ ایک ادنیٰ طبقے اور کم تر انسان میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور

جب وہ اپنی انسانیت سے محروم ہو جاتے ہیں، ان کی بے توقیری اور تذلیل کی کوئی حد باقی نہیں رہتی۔

نتائج کی برابری

بیشتر لوگ جب برابری کی بات کرتے ہیں، تو اس کا مطلب اخلاقی برابری، قانون کی نظر میں برابری، سیاسی برابری اور موقعے کی برابری کے اصولوں کے تحت ایک جیسے سلوک کا حق نہیں ہوتا۔ ان کا مطلب مادی صلوں میں برابری ہوتا ہے، جیسے کہ دولت، آمدنی، اور زندگی کے معیار۔ اور خاصے لوگ امیروں سے غریبوں کو دوبارہ تقسیم کی وکالت کرتے ہیں، تا کہ مادی صلوں کو برابر کیا جائے۔

آمدنی کی برابری کے اعداد و شمار

لوگ جو نتائج کی برابری کی وکالت کرتے ہیں، اکثر ان اعداد و شمار کا حوالہ دیتے ہیں، جنھیں ''جینی کوایفیشینٹ'' کہا جاتا ہے۔ یہ نام اطالوی شماریات دان اور عمرانیات دان کوراڈو جینی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ جیسے کہ آمدنی کی پیمائش کے ضمن میں نابرابری کا اشاریہ ہے۔ صفر، جینی کو ایفیشیٹ کا مطلب ہے کہ مکمل برابری ہے، ایک عدد جینی کوایفیشینٹ کا مطلب ہے مکمل نابرابری (جیسے کہ کُل آمدنی کا مالک ایک شخص ہے)۔

مختلف ادارے، جیسے کہ ورلڈ بینک اور ریاست ہائے متحدہ کی سی آئی اے مختلف ملکوں کے جینی کوایفیشینٹ کی پیمائش کرتے ہیں، اور یوں نابرابری کے حساب سے ان کی درجہ بندی کرتے ہیں۔ ان درجہ بندیوں سے پتا چلتا ہے کہ بیشتر ترقی یافتہ ملکوں کا کوایفیشینٹ 0.25 سے لے کر 0.5 تک ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں اونچی سطح کی برابری موجود ہے۔ سب سے بڑھ کر نابرابری افریقی ملکوں میں پائی جاتی ہے، جہاں کوایفیشینٹ 0.7 کے اردگرد ہے، اور ان میں جنوبی افریقہ سرفہرست ہے۔

ہمیں اس حساب کتاب کے بارے میں شکوک رکھنے چاہییں، اور اس تجویز کے بارے میں کہیں زیادہ شکوک کا حامل ہونا چاہیے کہ اونچے کوایفیشینٹ والے ملکوں میں آمدنیوں کو جبری طور پر برابر کرنا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ چند ہی ملک ہیں، جن کے بارے میں قابلِ اعتبار اعداد وشمار دستیاب ہیں، یوں خود جینی کوایفیشینٹ ایک ناقابلِ اعتبار پیمائش بن جاتا ہے (جس کی وجہ سے مختلف ادارے، جو اس کی پیمائش کرتے ہیں، ان کے اعداد وشمار مختلف ہوتے ہیں)۔ دوسری بات یہ کہ آمدنیوں میں بڑا فرق، سماجی رجحانات کی عکاسی بھی کرسکتا ہے، جو واقعتاً مثبت ہوتے ہیں۔ ان کا مطلب نئی ٹیکنالوجی میں تیز رفتار ترقی، یا شہروں میں بڑھتی ہوئی خوشحالی ہوسکتا ہے، جو ابھی دیہی علاقوں میں نہیں پہنچی۔ یہ چیز بالکل بے معنی ہوگی کہ شہروں کے آئی ٹی کے کارکنوں کی آمدنی کو کسانوں کی آمدنی کے برابر گھٹا کر اس بڑھتی ہوئی خوشحالی کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ اس کے بجائے ہمیں ان رکاوٹوں کو ہٹا کر غریب تر لوگوں کو اس قابل بنانا چاہیے کہ وہ بھی اس خوشحالی میں شامل ہوں، جو موجودہ طور پر انھیں ایسا کرنے سے روک رہی ہیں۔

اعداد وشمار کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ خام آمدنی کا موازنہ کرتے ہیں، اور ان ٹیکسوں کو، جو لوگ ادا کرتے ہیں، اور حکومت کی طرف سے ملنے والے فوائد (امداد، پینشن، مفت حفظانِ صحت اور وغیرہ) کو نظر انداز کرتے ہیں۔ یو کے میں ذرا مختلف پیمانہ استعمال کیا جاتا ہے، جہاں اوپر کے دس فیصد کمانے والوں کی خام آمدنی نیچے والے دس فیصد کی خام آمدنی کا دس گنا ہوتی ہے، یہ بہت زیادہ نابرابری معلوم ہوتی ہے۔ جبکہ لوگ جب اپنے ٹیکس دے دیتے ہیں، حکومت کی طرف سے ملنے والے مختلف فوائد حاصل کر لیتے ہیں، تو یہ معتدل 6 سے زیادہ نہیں۔ لوگ پھر بھی پہلے اعداد وشمار کا حوالہ دیتے ہیں، تا کہ آمدنیوں کی دوبارہ تقسیم کو جواز مل سکے، جبکہ یہ اعداد وشمار کا دھوکہ آمیز استعمال ہے۔

آمدنی کی برابری یا دولت کی برابری؟

اس خیال کو کہ لوگوں کو معاشرے میں اپنی شمولیت سے یکساں فوائد ملنے چاہییں،

مساوات پسندی کہا جاتا ہے۔ مگر اس اصطلاح کا درست مفہوم بیان کرنا مشکل ہے، اس کا جزوی سبب خود اس کے اپنے تضادات ہیں۔

مساوات پسند اس بارے میں صاف ذہن نہیں ہو سکتے کہ آیا وہ آمدنیوں کی برابری چاہتے ہیں، یا دولت کی برابری چاہتے ہیں۔ اگر ان کا مطلب ہے کہ دولت کی برابری ہونی چاہیے، تو انھیں دولت کے بڑے فرق کو قبول کرنا ہوگا، جو کہ یقیناً پیدا ہوں گے۔ ایک شخص اپنی آمدنی میں سے بچاتا ہے اور عقل مندی سے اس کی سرمایہ کاری کرتا ہے، اور یوں سرمایہ اور دولت کماتا ہے۔ جبکہ دوسرا شخص، جس کے پاس یکساں آمدنی ہے، جوا کھیل سکتا ہے یا اسے ذاتی تسکین کے لیے خرچ کر سکتا ہے۔ کم ہی عرصے میں ان کی دولت میں بڑا فرق پیدا ہو جائے گا۔

یہ بھی کہ اگر تمام نوکریوں کی تنخواہ برابر کر دی جائے، تو ایسی نوکریوں کی طلب بڑھ جائے گی، جو آسان اور خوشگوار ہوں گی اور ایسے افراد کی شدید کمی واقع ہو جائے گی، جو ایسی نوکریاں کرنا چاہیں گے، جو مشکل اور ناخوشگوار ہوں گی۔ کسی کو کیا پڑی کہ وہ محنت کرے، جبکہ سست لوگوں کو اور انھیں ملنے والا صلہ برابر ہے۔

ایک نوکری، مادی آمدنی سے کہیں بڑھ کر ایک چیز ہوتی ہے۔ ایک چیز اور ہوتی ہے، جسے معیشت دان نفسیاتی آمدنی کہتے ہیں، مثلاً پسندیدہ شرکائے کار، یا ملک کے کسی اچھے علاقے میں ملازمت، یا شہر کے بہتر اور سہولتوں کے حامل علاقے میں نوکری۔ یہ خوبیاں ان لوگوں کے لیے بہت قابلِ قدر ہوتی ہیں، جو ان سے لطف اٹھاتے ہیں، مگر یہ ایسی چیزیں نہیں، جنھیں برابر کیا جا سکتا ہو۔

اگر دوسری طرف مساوات پسندوں کا مطلب یہ ہے کہ دولت کو برابر کیا جانا چاہیے، تو پھر بھی آمدنیوں میں بڑا فرق باقی رہے گا، کیونکہ اس کا دارومدار لوگوں کی مہارتوں اور ذہانتوں اور ان کے لیے آجروں کی طلب پر ہوتا ہے۔ اگر کچھ لوگ بچاتے ہیں اور یوں اپنی دولت میں اضافہ کرتے ہیں، جبکہ دوسرے اسے خرچ کرتے اور اس میں کمی کر لیتے ہیں، تو ان کی دولت میں جلد

فرق پیدا ہو جائے گا۔ پھر کیا کیا جائے؟ ولفریڈ پِکلز، جو 1950ء کی دہائی میں یوکے ریڈیو کے ایک ہر دلعزیز شو، ''ہیوا ے گو'' کا میزبان تھا، وہ اپنے شو کا آغاز مقابلے میں حصہ لینے والوں سے خود ان کے اور ان کی خواہشات کے بارے میں سوالوں سے کیا کرتا تھا۔ ایک شخص نے کہا: 'میری خواہش یہ ہے کہ دنیا میں جتنی دولت ہے وہ سب میں حاصل کرلوں اور اسے ہر کسی میں برابر تقسیم کر دوں۔' اس نیک خواہش پر بہت تالیاں بجیں۔ بدقسمتی سے اس نے سارے اثر کو یہ اضافہ کر کے ضائع کر دیا: 'اور جب میں اپنا حصہ ختم کرلوں گا، ہمیں اسے دوبارہ کرنا چاہیے۔' ایک بدلتی دنیا میں دولت کو برابر رکھنا مشکل ہے۔

نتائج کی برابری، خواہ یہ آمدنی کی ہو یا دولت کی، دونوں غیر فطری اور باقی نہ رہنے والی ہیں۔ کسی کو بھی برابر کرنے، اور انھیں برابر رکھنے کا مطلب آزادی اور خوشحالی پر بہت بڑا حملہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کچھ لوگوں سے دولت جبری طور پر لے لی جائے گی، اور دوسروں کو دی جائے گی، اور چیزوں کو قریب قریب برابر رکھنے کی خاطر بار بار ایسا کیا جائے گا۔

کچھ دولت ایسی ہوتی ہے، جسے ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور دوبارہ تقسیم کرنا ناممکن ہے: ایک پیچیدہ اور کام کرتے ہوئے، دولت پیدا کرنے والے کارخانے کو اس کے ٹکڑوں اور اس کی مشینوں کو پُرزوں میں تقسیم تو کیا جا سکتا ہے، مگر پھر یہ کچھ بنائے گا نہیں۔ نہ ہی پیسے کو دوبارہ تقسیم کرنے کے لیے اسے بیچا جا سکے گا، مراد یہ کہ ایک ایسی دنیا میں جہاں دولت برابر ہوگی، وہاں کوئی فرد اسے خریدنے کے قابل وسائل کا حامل نہیں ہوگا۔

دولت کی دوبارہ تقسیم کی ایسی پالیسیاں پُرتشدد اور بہت زیادہ ناکارگر ہوں گی۔ یہ لوگوں کو ان کی محنت کا پھل حاصل نہیں کرنے دیں گی، اور کام کرنے اور بچانے کی ساری ترغیبوں کو ختم کر دیں گی۔ وہ دولت کو دوبارہ تقسیم کرنے کے بجائے، اسے تباہ کر دیں گی۔ اور ان کا نفاذ کرنے کے لیے بہت بڑی سیاسی طاقت درکار ہوگی، ایسی طاقت جو ایک آزاد معاشرے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔

دوبارہ تقسیم کی میکانکیت

ایک اور مسئلہ یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کس کس کو دوبارہ تقسیم کے عمل کا حصہ بنایا جائے۔ عام طور پر، دولت مند ملکوں کے مساوات پسند اپنی تجاویز کو اپنے ملکوں یا، زیادہ سے زیادہ، ملتے جلتے ملکوں تک محدود رکھتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آمدنی یا دولت کو باقی دنیا کے ساتھ تقسیم کرنے کا مطلب (اگر یہ ممکن ہو سکے) امیر ملکوں کے لوگوں کی زندگی کے معیاروں میں شدید کمی ہوگا۔ یہ کوئی ایسی پالیسی نہیں، جسے پُرامن طریقے سے قبول کرلیا جائے گا۔

اس کے برعکس، غریب ملکوں کے مساوات پسند عام طور پر برابری کے ایک عالمی وژن کی بات کرتے ہیں: وہ دلیل دیتے ہیں کہ امیر ملکوں کی دولت بانٹنے کا مطلب ان کی لُٹی پُٹی آبادیوں کے لیے بہت بڑا فرق پیدا کرے گا۔ مگر یہ ایک ناممکن خواب ہے، کیونکہ امیر ملک اس پر کبھی راضی نہیں ہوں گے۔

نہ ہی ایسی دوبارہ تقسیم غریب لوگوں کے لیے ہمیشہ رہنے والی دولت کو جنم دے گی۔ دولت ایک 'نتیجہ صفر کھیل' نہیں۔ دولت کا کوئی مقررذخیرہ نہیں، کہ ایک شخص صرف اس وقت زیادہ امیر بن سکتا ہے، جب دوسرا زیادہ غریب بنے۔ دولت، جدت، کاروبار، تجارت اور سرمائے کی تشکیل کے ذریعے تخلیق ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے پیداواری سرمائے کو تباہ کرنے سے، جو اس کے حامل ہیں، ان کی مدد نہیں ہوتی، جو اس کے حامل نہیں۔ ایک بہتر پالیسی ترغیبوں سے نبٹنا ہوگا، جیسے کہ جنگ اور چوری، جو غریب قوموں کے لوگوں کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں کہ وہ خود اپنا سرمایہ جمع نہ کریں۔

یہ سوالات کہ کیا کچھ دوبارہ تقسیم کیا جائے گا اور کسے کیا دیا جائے گا اور کس سے لے کر کیا جائے گا، اس بات کو صاف کر دیتا ہے کہ اس بات پر کبھی اتفاق ممکن نہیں کہ دوبارہ تقسیم سے متعلق پالیسی کیسی ہوگی۔ پھر بھی دوبارہ تقسیم کو مفید بنانے کے لیے ایک ٹھوس منصوبہ چاہیے، ہر کوئی جس کو مانتا ہو۔ اگر اتفاق نہیں ہوتا، تو اس کے حصول کا واحد راستہ جبر رہ جاتا ہے۔

مادی برابری کے لیے جبری قبولیت ہر کسی کے لیے اس نکتے کو تباہ کر دے گی کہ وہ اپنی بہتری کی کوشش کرے۔ کیونکہ جدت، کاروبار یا سخت محنت کے ذریعے آپ جو مادی فائدہ حاصل کرتے ہیں، اگر اسے چھین لیا جائے گا، تو کوئی اس کے لیے کوشش کیوں کرے گا؟ اور یہ انسانیت کے لیے اس سے کہیں گہرا نقصان ہوگا۔ کاروبار تخلیقی چیز ہے: لوگ جو بہتر اشیا اور خدمات پیدا کرنے کی تگ و دو کرتے ہیں، وہی نئی اشیا، نئے عمل اور نئی ٹیکنالوجی دریافت کرتے ہیں، جس سے ہر کسی کی زندگی میں بہتری آتی ہے۔ اس کاروباریت اور تخلیقیت کا گلا گھونٹ کر مساوات پسندی پوری دنیا کی مادی زندگیوں میں مسلسل بہتری کے امکان کو ختم کر دیتی ہے۔

برابری اور انصاف

انصاف کے دو مفہوم

بہت سے لوگ جو دولت یا آمدنی کی دوبارہ تقسیم کی وکالت کرتے ہیں، وہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ 'ناانصافی' ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کی نسبت زیادہ امیر ہوں اور چند ایک جو بہت ہی غریب ہیں ان سے کہیں زیادہ امیر ہوں۔ اس 'سماجی ناانصافی' کو یہ حقیقت اور پیچیدہ بنا دیتی ہے کہ لوگوں کی دولت 'معاشرے کے لیے قابلِ قدر ہونے کی' عکاسی نہیں کرتی۔

تاہم، یہ دلیل لفظ 'انصاف' کو اغوا کر لیتی ہے، جسے ہم سب ایک اچھی اور پسندیدہ چیز کے طور پر قبول کرتے ہیں، اور جو بطور انسان ہم سب کو درکار ہے، اور اس لفظ کو ایک بالکل مختلف مفہوم دے دیتی ہے، یعنی برابری اور جائز کا مفہوم۔

انصاف کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کس قسم کے طرزِ عمل کی توقع کرتے ہیں۔ اگر کوئی کسی معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے یا چوری کرتا ہے، ہم کہتے ہیں اس نے ناانصافی کی ہے، کیونکہ کسی کو 'کوئی نقصان نہیں' کے اصول اور ہمارے قانونی اور اخلاقی قاعدوں کی رو سے یہ طرزِ عمل ممنوع ہے۔ دوسرے الفاظ میں، انصاف کا یہ مفہوم، یعنی تبادلاتی

انصاف، اس چیز سے تعلق رکھتا ہے کہ وہ کس طرح پیش آتے ہیں۔ اس کا اطلاق صرف وہاں ہوتا ہے، جہاں لوگ ارادے کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ اگر کسی کو انفلوئینزا ہو جاتا ہے یا وہ کسی جسمانی معذوری کا شکار ہے، یہ ایک بدقسمتی ہے، لیکن یہ ناانصافی نہیں، کیونکہ کوئی بھی ناانصافی کے ساتھ پیش نہیں آیا۔

لفظ 'انصاف' کے دوسرے استعمال کو بعض اوقات تقسیمی انصاف کہا جاتا ہے، یہ لوگوں کے درمیان طرزِ عمل سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ ان کے درمیان چیزوں کی تقسیم سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر بھی ایک آزاد معاشرے میں دولت یا آمدنی کی جو تقسیم سامنے آتی ہے، وہ سادہ طور پر لوگوں کی رضا کارانہ معاشی سرگرمی کا نتیجہ ہوتی ہے، جہاں ہر کوئی قانونی اور اخلاقی قاعدوں پر عمل کرتا ہے۔ یہ 'ناانصافی' نہیں ہوسکتا، کیونکہ کوئی بھی ناانصافی کے ساتھ پیش نہیں آیا۔ کوئی بھی یہ مخصوص نتیجہ نہیں چاہتا تھا؛ یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے۔

معاشرے کے لیے قابلِ قدر ہونا

'سماجی انصاف' کی اصطلاح کا استعمال اس غلطی کا ارتکاب کرتا ہے کہ معاشرہ ایک شخص کی طرح ہے، جو دولت اور آمدنی کی اس ترتیب کا فیصلہ کرتا ہے۔ مگر 'معاشرے' کا خود اپنا کوئی ارادہ نہیں؛ صرف افراد فیصلے کر سکتے اور ان پر عمل کر سکتے ہیں۔ اور افراد کے درمیان سماجی اور معاشی پالیسی کے معاملات پر سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ 'سماجی انصاف' کا تصور بہت سے لوگوں کو اپیل کیوں کرتا ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ اس ضمن میں بے انتہا مبہم ہے کہ اصل میں کیا نتیجہ سامنے آنا چاہیے، اور یہ ان اختلافات پر پردہ ڈالتا ہے۔

جب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ صِلوں کی سماجی طور پر 'منصفانہ' تقسیم کس طرح کی ہوگی، تو اس کے بارے میں کسی فیصلے تک پہنچنا ناممکن ہے، اور یوں یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ آمدنی کی مکمل برابری، درست ہدف نہیں، کیونکہ یوں افراد کو یکساں صلہ ملے گا، قطع نظر اس سے کہ وہ کتنا سست ہونا، یا رکاوٹ ڈالنے والا بننا پسند

کرتے ہیں۔ صاف بات ہے کہ صلے کو کوشش یا حصول کو پیشِ نظر رکھنا ہو گا۔ لہٰذا، ایک عام نظریہ یہ ہے کہ مکمل برابری کے بجائے، لوگ' معاشرے کے لیے کتنا قابلِ قدر' ہیں، صلے اس کے حساب سے بانٹے جائیں۔

مگر اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ کون شخص معاشرے کے لیے قابلِ قدر ہے؟ معاشرہ کوئی شخص نہیں، اور خود اس کی اپنی کوئی قدریں نہیں۔ لوگ کسی چیز کو قدر کا حامل نہیں بنا سکتے، جس کی خود اپنی کوئی قدر نہیں۔ صرف افراد قدروں کے حامل ہوتے ہیں، اور یہ قدریں بہت مختلف ہوتی ہیں، اور اکثر ان میں تصادم بھی ہوتا ہے۔ لوگوں کا ایک گروہ باکسروں کی کارکردگی کو قابلِ قدر سمجھ سکتا ہے، جبکہ دوسرے وائلن بجانے والے کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ یہ کہنا ناممکن ہے کہ معاشرے کو کون زیادہ قدر عطا کرتا ہے، کیونکہ مختلف لوگوں کی خوشی کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم کسی نرس، کسی قصائی، کسی کان کن (جو کوئلے کی کان میں کام کرتا ہے)، کسی جج، کیس غوطہ خور، کسی ٹیکس انسپیکٹر، زندگی بچانے والی دوا کے کسی موجد، یا ریاضی کے کسی پروفیسر کے بارے میں کیسے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون معاشرے کے لیے قابلِ قدر ہے؟

قابلیت کے حساب سے تقسیم

مساوات پسند ایک تجویز اور پیش کرتے ہیں کہ صِلوں کو 'قابلیت' کے حساب سے تقسیم کیا جانا چاہیے۔ مگر پھر وہی مسئلہ ہے کہ مختلف لوگوں کی نسبتی 'قابلیت' کے بارے میں غیر جذباتی انداز میں فیصلہ کرنے اور پھر انھیں صلہ عطا کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ مختلف لوگوں کے نظریات اس ضمن میں بہت مختلف ہو سکتے ہیں کہ مختلف صلاحیتیں کتنی مفید ہوتی ہیں۔

بہرصورت، یہ فیصلہ کرنے میں عملی مسائل حائل ہوتے ہیں کہ کتنی قابلیت کی ضرورت ہے۔ کیا ایک شخص جو عمر بھر محنت کرتا ہے اور ناکام رہتا ہے، کیا اس کی 'قابلیت' کا صلہ دیا جانا چاہیے؟ جبکہ ایک اور شخص جو لاکھوں لوگوں کے لیے قابلِ قدر ثابت ہوتا ہے، اسے سزا ملنی چاہیے، کیونکہ اس کا یہ کام ایک خوش قسمت حادثے کا نتیجہ تھا؟ ہم ایسی محنت کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا

چاہتے، جو بے ثمر ہو: معاشی ترقی، ہم جو کچھ پیدا کرتے ہیں، اس کی قدر بڑھانا ہے، اور اس قربانی کو گھٹانا ہے، جو اس کے لیے دینا پڑتی ہے۔ لوگوں کو ذاتی قربانی کا صلہ دینے سے ان میں قربانی کی حوصلہ افزائی ہوگی، لوگوں کی خدمت کی نہیں۔ ایسے اصول کے بل پر معیشت نہیں چل سکتی۔

مارکیٹ جو صلہ دیتی ہے، وہ پیداکاروں کی اخلاقی اور ذاتی قابلیت کی عکاسی نہیں کرتے، نہ ہی اس وقت اور کوشش کی جو وہ اپنی اشیا اور خدمات کو مارکیٹ تک لانے کے لیے صرف کرتے ہیں۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان کی اشیا پر برسوں کی محنت اور سرمایہ کاری صرف ہوئی ہے، یا وہ کسی خوش قسمت حادثے کا نتیجہ ہیں۔ لیکن مارکیٹ جو صلہ دیتی ہے، وہ اس لطف اور قدر کی عکاسی کرتا ہے، جو وہ لوگوں کو مہیا کرتے ہیں۔ گاہک، پیداکاروں کو ان کی اشیا اور خدمات کی ادائیگی اس لیے کرتے ہیں کیونکہ ان اشیا کو قابلِ قدر سمجھتے ہیں۔ اور یہی وہ اصل مفہوم ہے، جس میں مارکیٹ کا صلہ اس قدر پر منحصر ہوتا ہے، جو لوگ معاشرے کے دوسرے ارکان کو مہیا کرتے ہیں۔ وہ پیداکاروں کی کمیابی اور ذہانت، اور گاہکوں کی تعداد کی عکاسی بھی کرتے ہیں، جو اس خدمت کی مانگ کرتے ہیں اور اس شدت یا اہمیت کی بھی، جس کے ساتھ وہ ان اشیا کی مانگ کرتے ہیں۔

ضرورت کے مطابق تقسیم

ایک اور مساوات پسندانہ تجویز یہ ہے کہ وسائل کو 'ضرورت' کے حساب سے تقسیم کیا جانا چاہیے۔ لیکن پھر وہی مسئلہ ہے کہ یہ فیصلہ کون کرے کہ 'ضرورت' کیا ہے۔ کوئی ایسی لکیر نہیں، جو ضرورت مند لوگوں کو غیر ضرورت مند لوگوں سے علاحدہ کرتی ہو۔ لوگوں کے حالات بہت مختلف ہوتے ہیں؛ ان کی دولت اور آمدنی مختلف ہوتی ہے، لیکن اس میں بہت زیادہ اتار چڑھاؤ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بہت عمدہ اور بہت گندی جگہوں پر رہائش پذیر ہوتے ہیں؛ ان کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں، اور مختلف جگہوں پر مختلف لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ ان غیر مالیاتی فائدوں کو، جیسے کہ دوستانہ ماحول میں شرکائے کار کے ساتھ پسندیدہ نوکری کرنا، اعداد

میں بیان کرنا ناممکن ہے۔

لہٰذا، یہ معاملہ کہ آیا لوگ 'ضرورت مند' ہیں یا نہیں، ایک رائے دینے والا معاملہ ہے، اور مختلف لوگوں کا اندازہ مختلف ہوگا۔ضرورت کی بنیاد پر دوبارہ تقسیم صرف اس صورت میں قابلِ عمل ہوگی، جب کوئی سیاسی طاقت کو اس بات کے فیصلے کا اختیار دیا جائے کہ 'ضرورت' کیا ہے، اور اس پر عمل کرے۔لیکن ایک آزاد معاشرے میں لوگ کسی طاقت کو یہ اختیار دینے پر کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ یہ اپنی زندگیوں پر مکمل اختیار دینا ہوگا۔ وہ آزاد لوگ نہیں رہیں گے۔ وہ اس طاقت کے غلام بن جائیں گے۔

نہ ہی ضرورت کا موجود ہونا دوسروں پر کوئی 'ذمے داری' عائد کرتا ہے۔ایک شخص جس کا گردہ کام کرنا چھوڑ گیا ہو، اسے ایک نئے گردے کی ضرورت ہوسکتی ہے۔لیکن یوں کسی دوسرے پر یہ ذمے داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ اپنا ایک گردہ عطیہ کردے۔قریبی رشتے دار عطیہ کرنے کے اخلاقی اور خاندانی فریضے کو محسوس کرسکتے ہیں، اور اجنبی بھی ہمدردی کے جذبے سے متاثر ہوسکتے ہیں۔مگر اس کا انحصار ان کے انتخاب پر ہے۔ہم ایسے اقدامات کی حوصلہ افزائی اور تعریف کرسکتے ہیں، لیکن ایک آزاد معاشرہ، افراد کو اس بات پر مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ دوسروں کی مدد کریں۔

ایک آزاد معیشت چیزوں کو کسی جبر کے تحت تقسیم نہیں کرتی، بلکہ اس قدر کے مطابق تقسیم کرتی ہے، خریدار ان اشیا یا خدمات کو جس کا حامل سمجھتے ہیں، جنھیں مارکیٹ کی معیشت پیدا کرتی ہے۔مثلاً اگر لوگ آرگینک کے بجائے فارمی مچھلی، یا شوز کے بجائے سینڈل کو ترجیح دیتے ہیں، تو وہی چیز پیدا کی جاتی ہے۔اور مارکیٹ کی معیشت وسائل کو بھی اسی قدر کے مطابق تقسیم کرتی ہے، لوگ جس کا اظہار دوسروں کے لیے اپنے خدمتِ خلق کے تحفوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ ایسے فیصلوں کو لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے: یہ تصور کہ صرف ریاست جانتی ہے کہ کن مقاصد کی حمایت کی جانی ہے، ایک آزاد معاشرے میں مسترد کردیا جاتا ہے۔

مساوات پسندی کے مزید نقصانات

مساوات پسندی 'سماجی انصاف' پر جوزور دیتی ہے، اس کا ایک نقصان دہ نتیجہ یہ ہے کہ یہ اصل اور تبادلاتی انصاف کے تصور اور حقیقت کو گہنا دیتی ہے۔ وہ بنیادی اصول، جو ایک آزاد معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں، جیسے کہ قانون کی نظر میں برابری، یہ نئی اصطلاح انھیں مبہم بناتی اور کمزور کردیتی ہے۔ دوبارہ تقسیم کی صورت میں، سلوک میں برابری ممکن نہیں ہوسکتی: لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک کے بجائے، ہمیں دینے والوں سے مختلف مقدار میں لینا ہوگا، اور ہر لینے والے کو مختلف مقدار میں دینا ہوگا۔

مادی خواہشیں باقی رہتی ہیں

جبکہ اصل انصاف، تنازعات حل کرنے کے لیے ہوتا ہے، 'سماجی انصاف' حقیقتاً تنازعات کو جنم دیتا ہے۔ جب کوئی حکومت، قابلیت، یا ضرورت، یا معاشرے کے لیے قابلِ قدر ہونا کی بنیاد پر آمدنی کو دوبارہ تقسیم کرنے کی کوشش کرتی ہے، تو بہت سے مختلف گروہ اس پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے لگتے ہیں، اور تمام یہ دعوے کرتے ہیں کہ ان کے صِلوں میں اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ ان کے درمیان فیصلے کرنے کے لیے کوئی درست طریقہ دستیاب نہیں، یہ سیاسی تنازعہ بے بنیاد فیصلوں کا سبب بن جاتا ہے۔ بالآخر ظالمانہ طاقت چیزوں کا فیصلہ کرتی ہے، جو ایک آزاد معاشرے سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اور افراد، نظام کے اردگرد ایسے طریقے ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے، جن کی مدد سے وہ خود اور اپنے خاندانوں کو فائدہ پہنچاسکیں۔ سوویٹ یونین میں یقیناً یہی تجربہ ہوا، جہاں غالباً آبادی کی اکثریت اپنی زندگی کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے کسی نہ کسی قسم کی غیرقانونی سرگرمی میں ملوث تھی۔ جبری طور پر قائم کی گئی مادی برابری ان لوگوں کو مجرموں کی ایک قوم میں ڈھال دیتی ہے، جو بصورتِ دیگر قانون پر عمل کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔

امیروں کا کردار

آمدنی اور دولت کی نابرابریاں مثبت کردار بھی ادا کرتی ہیں۔لوگوں کی زیادہ کمانے اور دولت مند بننے کی خواہش ایک طاقت ور ترغیب ہے۔ یہ انھیں بہتر نوکریاں حاصل کرنے، اور ایسی بہتر اشیا ایجاد کرنے، پیدا کرنے اور تقسیم کرنے کی تحریک دیتی ہے، جو دوسرے لوگوں کی زندگیاں بہتر بناتے ہیں۔امیر لوگ ان نئی اشیا کو آزمانے والے بن کر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

بیشتر نئی اشیا بازار میں تعیّشات کے طور پر آتی ہیں، ابھی ان کے لیے بڑی مارکیٹ پیدا نہیں ہوئی ہوتی، اور انھیں بہت کم تعداد میں بنایا جاتا ہے، جس پر بہت زیادہ لاگت آتی ہے۔لہٰذا، انھیں دولت مند لوگ خریدتے اور آزماتے ہیں۔ ان لوگوں کی فیڈ بیک، پیدا کاروں کو اس قابل بناتی ہے کہ اس شے کی طلب کی سطح کیا ہے، اور اس میں کہاں اور کیسی بہتری کی ضرورت ہے۔ یہ انھیں خراب اشیا کو نہ بنانے کے متعلق بتاتی ہے، اس سے پہلے کہ وہ اسے بڑے پیمانے پر بنانا شروع کریں، اور انھیں ان اشیا کو بڑے پیمانے پر مارکیٹ میں لانے کی خاطر ان کی کوالیٹی کو بہتر بنانے کے متعلق بتاتی ہے۔اس طرح، پہلے پہل خریدار بن کر دولت مندوں کا تجربہ ہر کسی کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

دولت اور زیادہ آمدنی کے حامل لوگ دوسرے اہم سماجی کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ان کے پاس نئی اشیا اور خدمات کے تجربے کی خاطر مہیا کرنے کے لیے وسائل ہوتے ہیں، جس سے لوگوں کے انتخاب میں وسعت آتی ہے اور یوں بہتری کا عمل آگے چلتا ہے۔ وہ فنون، تعلیم اور تحقیقی منصوبوں کے لیے پیسہ مہیا کر سکتے ہیں، جن پر ان کی نظر میں حکومت توجہ نہیں دے رہی۔ اور ان کے پاس مالی وسائل ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ نئے سیاسی خیالات کو پھیلا کر حکومت کے جبر کو چیلنج کر سکتے ہیں، جنھیں حکومتی اہل کار بہت زیادہ خطرناک سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تمام باتیں اہم ہیں، اگر ہم ایک آزاد معاشرے کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔

سرمائے کی تباہی

ہر کوئی پیداواری وسائل کا یکساں بہتر استعمال کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ جو کاروبار کا پیشہ اختیار کرتے ہیں، انھیں اس قابل بننا پڑتا ہے: اگر وہ اپنے کاروبار سے نفع کمانا چاہتے ہیں، تو انھیں نقصانات سے کھیلنا سیکھنا پڑتا ہے اور پیداواری وسائل کو یوں استعمال کرنا پڑتا ہے کہ بہتر اور سستی اشیا بنائی جائیں۔ لیکن دوبارہ تقسیم وسائل کو ان مہارت یافتہ کاروباریوں کے ہاتھوں سے چھین لیتی ہے، اور انھیں دوسروں تک پھیلا دیتی ہے۔ اس کا مطلب ہے سرمائے اور سرمائے کی تخلیق کا نقصان۔ مگر یہ سرمایہ ہوتا ہے، جو کسی معیشت کو پیداواری بناتا ہے۔ یہ جتنا کم تخلیق ہوتا ہے، اتنے وسائل زیادہ خرچ ہوتے ہیں، اور یوں معاشرے کی طویل مدتی خوشحالی کو لازماً زوال آتا ہے۔

نابرابری بھی معاشی بہتری کا سبب بنتی ہے۔ کامیاب پیداکار، جو زیادہ نفع کماتے ہیں، وہ ایک مقناطیس کی طرح ہوتا ہے، جو لوگوں اور وسائل کو ادھر کھینچتا ہے، جدھر زیادہ قدر حاصل کی جا سکتی ہو، اور کم پیداواری اور کم قدر والے استعمال سے دور لے جاتا ہے۔ لہٰذا، لوگ اور سرمایہ ادھر جاتے ہیں، جدھر وہ مستقبل کی آمدنیوں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرتے ہوں۔ یہ ایک مسلسل، متحرک، پھلنے پھولنے والا عمل ہے۔ نابرابری، جس پر بہت سے لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں، اصل میں یہی وہ کشش ہے، جو لوگوں اور وسائل کو ان کے زیادہ سے زیادہ پیداواری استعمال کی طرف موڑتی ہے، اور یوں ہر جگہ خوشحالی کو بڑھاتی ہے۔ اگر برابری کی خاطر ہم آمدنیوں کو دوبارہ تقسیم کرتے ہیں، تو ہم کشش کی اس قوت کا راستہ روکتے ہیں، اور مستقبل کی اس قدر، پیداوار اور افزائش سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، جسے یہ پیدا کر سکتی تھی۔ چونکہ بیشتر غریبوں کا انحصار اسی ترقی پاتی معیشت پر ہوتا ہے، تو یہ یہی ہوتے ہیں، جنھیں سب سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ ہم اسے 'سماجی انصاف' کیسے کہہ سکتے ہیں؟

ٹیکس اور فلاح

دولت یا آمدنی کی مکمل برابری ایک ناممکن مقصد ہوسکتا ہے، مگر بیشتر حکومتیں اس کے قریب تر پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس کی خاطر، وہ ترقی پسندانہ ٹیکس لگاتی ہیں، جو دولت مند لوگوں پر ٹیکس کی اونچی شرحیں مسلط کرتے ہیں۔ لیکن یہ ٹیکس نہایت نقصان دہ ہوسکتے ہیں۔ کوشش اور محنت کے صِلوں کو گھٹا کر، وہ ان مفید سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں، اور اس روزگار اور بہتری کی بھی، جسے یہ تخلیق کرتی ہیں۔

اس سے بھی بدتر یہ کہ ان ٹیکسوں کو اکثر بچتوں اور سرمائے پر عائد کیا جاتا ہے۔ بچتوں پر جو ٹیکس عائد کیے جاتے ہیں، وہ لوگوں کے پاس جو پیسہ ہوتا ہے، اور جسے انھوں نے کاروباری کاموں میں لگانا ہوتا ہے، اس میں کمی کر دیتے ہیں؛ یہی پیسہ ہوتا ہے، جس نے پورے معاشرے میں خوشحالی میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ سرمائے پر جو ٹیکس لگائے جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پیداواری اثاثوں کی تعمیر کے لیے کم وسائل استعمال کیے جائیں گے، اور یوں مستقبل میں پوری آبادی کی خوشحالی میں کمی آئے گی۔

ایک آزاد معاشرے میں، تجارت اور تبادلہ خالصاً رضا کارانہ ہوتے ہیں۔ پیداکار صرف اس صورت میں پیسہ کما سکتے ہیں، جب وہ ایسی اشیا اور خدمات تخلیق کرتے ہیں، جنھیں دوسرے لوگ چاہتے ہیں اور ان کے لیے ادائیگی پر تیار ہوتے ہیں۔ جو لوگ دولت مند بنتے ہیں، وہ کسی کو لوٹتے نہیں۔ وہ کسی ناانصافی کے مجرم نہیں ہوتے۔ ہم کسی ڈاکو کو اس بنیاد پر کسی کو لوٹنے نہیں دیں گے کہ یوں مادی نابرابری میں کمی واقع ہوگی: تو ہم حکومت کو ایسا کرنے کی اجازت کیوں دیں؟

پانچواں باب

آزاد کاروبار اور تجارت

آزاد منڈی کی معیشت

ایک آزاد معاشرے کا معاشی نظام، آزاد منڈی کی معیشت ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کے درمیان اشیا اور خدمات کے رضا کارانہ تبادلے کے ذریعے چلتا ہے؛ یہ بعض اوقات براہ راست انداز میں، لیکن عام طور پر پیسے کے واسطے کے ذریعے چلتا ہے۔ افراد اس بات میں آزاد ہوتے ہیں کہ وہ کیسے، کب کہاں، اور کس کے ساتھ کام کرنا، خرچ کرنا، سرمایہ لگانا، بچانا اور تجارت کرنا چاہتے ہیں یا نہیں کرنا چاہتے۔ کسی کو بھی ایسے معاملات پر مجبور نہیں کیا جاتا۔

تعاون کو بڑھانے کے قاعدے

آزاد منڈی کی معیشت کوئی لاقانونیت جیسی چیز نہیں ہوتی، جہاں لوگ جو چاہیں، وہ کر سکتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ دوسروں کے لیے اس کے کیا نتائج ہوں گے۔ 'کسی کو کوئی نقصان نہیں' کا اصول اسی طرح لاگو ہوتا ہے۔ اور قانون کا ایک ڈھانچہ موجود ہوتا ہے، جو جائیداد کے حصول، اس کی ملکیت اور تبادلے، خود اپنی محنت پر لوگوں کے حقوق، اور معاہدوں کے نفاذ کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ قاعدے صرف افراد کے طرزِ عمل ہی کا نہیں، بلکہ شراکت، کمپنی اور فلاحی اداروں جیسے گروہوں کا احاطہ بھی کرتے ہیں۔ حکومت کا کردار ان قاعدوں کے انتظام کے ساتھ ساتھ، جو لوگوں کی جائیداد اور آزادی کی حفاظت کرتے ہیں، ان کے معاہدوں کا نفاذ بھی ہوتا ہے۔

تاہم، یہ کردار محدود ہوتا ہے۔ یہ قاعدے تجارت کو ہدایات دینے کے لیے نہیں، بلکہ اس کی سہولت کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسے دستی آتشدان کی طرح ہوتے ہیں، جس میں آگ موجود ہوتی ہے۔ اور یہ چیز اہم ہے کہ منڈی کی معیشت کی توانائی حد سے زیادہ قاعدوں اور ضابطوں کی وجہ سے ضائع نہ ہو۔ مگر جائیداد، تبادلے اور معاہدے سے متعلق بنیادی قاعدے لوگوں کو تعاون میں مدد دیتے ہیں، تاہم، وہ اپنے باہمی فائدے کی خاطر بھروسے، اعتماد اور سلامتی کی بنیاد پر خود انتخاب کرتے ہیں۔ اس طرح، کہیں زیادہ معاشی تعاون کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، اور فوائد میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا ہے، جو اس تعاون سے جنم لیتے ہیں۔

رضاکارانہ تبادلے کے فائدے

یہ خیال کرنا آسان ہے کہ تجارت سے صرف فروخت کرنے والے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ آخرِکار، جو لین دین ہوتا ہے، اس سے ان کے پیسے میں اضافہ ہوتا ہے، جب کہ خریدنے والے کے پیسے میں کمی آتی ہے۔ اس وجہ سے کچھ لوگ سوچتے ہیں کہ فروخت کرنے والے لالچی ہوتے ہیں اور خود اپنے نفعے میں دلچسپی رکھتے ہیں، دوسروں لوگوں کے فائدے میں نہیں۔

یہ سوچ غلط ہے۔ آخرِکار، پیسے کا فائدہ کیا ہے؟ پرانے دنوں میں جب پیسہ، سونے اور چاندی پر مشتمل ہوتا تھا، تو اس کا کچھ نہ کچھ استعمال کم از کم دھات کے طور پر بھی ہوتا تھا، جس سے زیورات اور سجاوٹ کی اشیا بنائی جا سکتی تھیں۔ لیکن کاغذ اور ادنیٰ دھاتوں سے بنے پیسے کے دوسرے استعمال کم ہی تھے۔ اس کا واحد فائدہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے تبادلے کے ذریعے دوسری اشیا و خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

دوسرے لفظوں میں، پیسہ، تبادلے کا ایک ذریعہ ہے۔ ایک خریدار اس کے تبادلے سے کوئی شے یا خدمت حاصل کرتا ہے؛ پھر فروخت کرنے والا اس کے تبادلے سے کسی اور سے مختلف اشیا و خدمات حاصل کرتا ہے۔ اس لین دین سے دونوں سمجھتے ہیں کہ وہ فائدے میں ہیں۔ دوسری صورت میں وہ اس پر راضی نہیں ہوں گے۔

تجارت قدر کیسے پیدا کرتی ہے؟

صاف بات ہے کہ انسانوں میں چیزوں کی قدر سے متعلق کتنا اختلاف پایا جاتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان میں سے ہر کوئی تبادلے سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ ایک گاہک جو مارکیٹ میں تاجر سے چکن خریدتا ہے اس کے نزدیک وہ چکن کے ساتھ تبادلے پر اٹھنے والے پیسے سے زیادہ قابلِ قدر ہوتا ہے۔ لیکن تاجر چکن کے بجائے، پیسے کو زیادہ قابلِ قدر سمجھتا ہے۔ جب یہ تاجر دوسری چیزیں، جیسے کہ روٹی، خریدنے کے لیے اس پیسے کو استعمال کرتا ہے، تو پھر وہی کچھ واقع ہوتا ہے۔ تاجر، اس پیسے کی نسبت، روٹی کو زیادہ قابلِ قدر سمجھتا ہے، بیکری والا جس کی مانگ کرتا ہے۔ ہر تین نے فائدہ حاصل کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان سب نے رضا کارانہ طور پر ان تبادلوں پر اتفاق کیا۔

اصل میں، چکن، پیسے اور روٹی کو وہ جتنا قابلِ قدر سمجھتے ہیں، اس قدر میں جتنا زیادہ فرق ہوگا، ان میں ہر ایک کو ان تبادلوں سے فائدہ ہوگا۔ انھیں جس چیز پر متفق ہونا ہے، وہ قاعدے ہیں، جیسے کہ جائیداد، دیانت داری اور معاہدے سے متعلق قاعدے، جن کے تحت وہ تجارت کرتے ہیں۔ یہی قاعدے آزاد منڈی کی معیشت کے ڈھانچے کو تشکیل دیتے ہیں۔ قطع نظر اس چیز سے کہ ہر لین دین کے شریک مکمل طور پر خود اپنا فائدہ سوچتے ہیں: ہر کوئی ان تبادلوں سے خود فائدہ اٹھاتا ہے، بلکہ دوسرے شخص کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔

تاہم، ان قاعدوں پر عمل کرنے سے، ہر کوئی بغیر سوچے سمجھے دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے، جیسے کہ ایڈم سمتھ کے الفاظ میں، کوئی 'نادیدہ ہاتھ' ان کی رہنمائی کرتا ہو۔ گو کہ لوگوں کو ان کا ذاتی مفاد تحریک دیتا ہے، مگر وہ رضامندی سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔

آج پیسے کے ذریعے کی مدد سے، ہم میں سے ہر کوئی تجارت کر سکتا ہے، تعاون کر سکتا ہے، نہ صرف دوسروں کے ساتھ، جو وہیں مارکیٹ میں موجود ہوتے ہیں، بلکہ لاکھوں دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی، جو ان ملکوں سے تعلق رکھتے ہوں گے، جہاں ہمارا کبھی جانا نہیں ہوگا، جن کی زبان ہم بول نہیں سکتے اور جن کی ثقافت اور سیاست کو ہم کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ روزانہ لاتعداد

لین دین ہوتے ہیں، جن سے ہر فریق فائدہ اٹھاتا ہے۔ لوگ تعاون کرتے ہیں۔ قدر پیدا ہوتی ہے۔ انسانوں کی زندگی میں بہتری آتی ہے۔ انسانیت خوشحالی سے ہمکنار ہوتی ہے۔

سب سے زیادہ فائدہ غریبوں کو ہوتا ہے

آزادانہ تبادلے کا یہ نظام اتنا فطری اور فائدہ بخش ہے کہ یہ ہر جگہ پھیل چکا ہے۔ یہ ان ملکوں میں غیر قانونی طور پر بھی موجود ہوتا ہے، یا اسے برداشت کیا جاتا ہے، جہاں ایک آئیڈیالوجی کے تحت آزاد مارکیٹ کو مسترد کیا جاتا ہے۔ بہت سے ملک (جن میں سے کئی ایشیا میں واقع ہیں) اپنے شہریوں کو ان کے ذاتی اور سماجی معاملوں میں آزادی کم ہی دیتے ہیں، مگر جہاں تک معاشی آزادی کا تعلق ہے، انھیں خاصی آزادی دینی پڑتی ہے۔

بلاشبہ، مسلم دنیا کے ابتدائی برسوں میں اور اس کے پھیلاؤ میں، تجارت اور بیوپار بہت اہم عامل تھے۔ دنیا میں تجارتی شاہراہوں کے کھلنے سے احیائے نو کے یورپ میں بے انتہا دولت تخلیق ہوئی، جس نے نتیجے کے طور پر فن، ثقافت اور علم کو پھلنے پھولنے میں مدد دی۔ دونوں امریکاؤں میں خوشحالی آنے کا سبب یورپ، اور پھر چین کے ساتھ تجارتی تعلقات تھے۔

لیکن یہ صرف دولت مند نہیں، جنھیں انسانی خوشحالی کی اس اٹھتی لہر سے سب سے زیادہ فائدہ ہوا۔ جہاں جہاں معاشی آزادی پہنچی، وہاں وہاں غریبوں کے معیارِ زندگی میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا۔ جیسا کہ امریکی معیشت دان، ملٹن فریڈ مین کا کہنا ہے، سامراجی روم میں پانی کی گھریلو دستیابی ایک ایسی تعیش تھی، جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا؛ مگر کسی رومن سینیٹر کو اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ پانی لانے کے لیے اس کے پاس تو ملازم ہوتے تھے۔ سامراجی روم کا غریب بہت بری حالت میں رہتا تھا؛ لیکن جدید روم کا غریب اب گرم اور ٹھنڈے پانی کے تعیش کے بارے میں کوئی فکر نہیں کرتا۔

اس کا اثر نمایاں طور پر اس چیز میں دیکھا جا سکتا ہے کہ حال ہی میں جیسے کہ چین اور بھارت میں بین الاقوامی تجارت اور مارکیٹ کے اصول پھیل چکے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ صرف

تین دہائیوں میں، ایک بلین یا اس سے زیادہ لوگ بدترین غربت سے باہر آ گئے ہیں۔ مزید لاکھوں لوگ متوسط طبقے میں شامل ہونے، اور موبائل فون، ٹیلی وژن اور موٹر ٹرانسپورٹ جیسے تعیّشات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، اور یقیناً ٹھنڈے، خشک اور آرام دہ دفتروں اور کارخانوں میں بھی کام کر رہے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ ہر موسم میں زمین پر کام کریں۔

دولت مند کیسے بنا جائے

پیداکاروں کو گاہکوں کا خدمت گزار بننا ہوگا

ایک آزاد معاشرے میں، گاہکوں کے پاس انتخاب ہوتا ہے۔ انھیں مخصوص پیداکاروں سے خریدنے پر مجبور نہیں کیا جاتا، جیسے کہ حکومت یا ان کے حواریوں کی اجارہ داریاں۔ اشیا مہیا کرنے والے آپس میں مل کر قیمتیں بڑھا سکتے ہیں، مگر ایسا جوڑ توڑ زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتا، کیونکہ ان میں سے ہی کوئی ایک زیادہ گاہکوں کو کھینچنے کی خاطر اپنے قیمتیں کم کر کے دھوکہ دے سکتا ہے۔ اس عرصے میں، دوسرے مہیا کرنے والے مارکیٹ میں آنے کے لیے آزاد ہوتے ہیں، اور ان فرموں کے ساتھ مقابلے کرتے ہیں، جو اپنی قیمتوں کو اونچا رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔

لہٰذا، ایک حقیقی مارکیٹ معیشت میں، جہاں مقابلہ موجود ہو، پیداکاروں کے پاس گاہکوں کے استحصال کی طاقت نہیں ہوتی۔ اگر وہ ایسی چیزیں پیدا نہیں کرتے، جنھیں لوگ چاہتے ہیں، اور ایسی کوالیٹی کی چیزیں پیدا نہیں کرتے، جیسی گاہک چاہتے ہیں، اور اس قیمت پر وہ چیزیں پیدا نہیں کرتے، جو گاہکوں کو پُرکشش لگتی ہیں، تو ان کا کاروبار جلد نقصان میں چلا جائے گا۔ افراد کو کارپوریشن کی طاقت کے آگے قیدی نہیں بنایا جاتا۔ اس کے برعکس، پیداکار صرف اس وجہ سے کاروبار میں باقی رہتے ہیں، کیونکہ وہ لوگوں کی طلب کے مطابق تبدیلی لاتے رہتے ہیں۔

ایک کمپنی بڑی ہو سکتی ہے، مگر اسے پھر بھی مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک بڑی فرم غالباً بہت سی مختلف اشیا بناتی ہے، اور بہت سے کاروبار کر رہی ہوتی ہے۔ مگر اسے نہ صرف دوسری

بڑی کمپنیوں سے مقابلے کا سامنا ہوتا ہے۔ اسے بہت سی دوسری چھوٹی کمپنیوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے، جو کاروبار کے کسی ایک حصے میں اس کے ساتھ مقابلہ کرسکتی ہیں۔ چونکہ چھوٹی کمپنیوں کے خرچے کم ہوتے ہیں، اس وجہ سے وہ بڑی کمپنیوں کی کچھ اشیا کو بہتر اور/ یا زیادہ سستی بنانے کے قابل ہوسکتی ہیں۔ نئی اور جدت لانے والی کمپنیاں، ایسی نئی اشیا بنا سکتی ہیں، جو کسی بڑی کمپنی کی ایک یا زیادہ اشیا کو بے کار بنا سکتی ہیں۔

لہٰذا، یہ بس ایک کہنے کی بات ہے کہ سرمایہ پسندی بڑی سے بڑی کمپنیوں کو پیدا کرتی ہے، جو بڑے پیمانے پر اشیا کی پیداوار (یعنی کم لاگت کے ساتھ زیادہ اشیا پیدا کرنا) کی کوشش میں، اجارہ داریاں بن جاتی ہیں۔ مگر ایسی معیشت کی اپنی لاگت ہوتی ہے: بڑی کمپنیوں کا انتظام بہت مشکل ہوتا ہے اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے میں سست ہوتی ہیں۔ جاننے کے لیے، پچاس برس پہلے کسی مغربی رسالے پر نظر ڈال لیں۔ اس وقت اشتہار دینے والی چند ہی کمپنیاں آج باقی ہیں۔ وہ سب اپنے مقابلہ کرنے والوں کے ہاتھوں بِک چکی ہیں، جو اپنی ابتدا میں چھوٹے تھے، لیکن جدت لانے یا کم لاگت پر کام کرنے والے تھے۔

معاشی طاقت پر کوئی پابندی نہیں

لہٰذا، کمپنیوں کی معاشی طاقت پر نسلوں کے درمیان کوئی پابندی نہیں ہوتی، نہ ہی ان لوگوں پر جو انھیں چلاتے ہیں۔ ایک آزاد معیشت میں لوگ دولت مند بن سکتے ہیں، مگر وہ اس وقت تک دولت مند رہتے ہیں، جب تک وہ لوگوں کے خدمت گزار، اور گاہکوں کے لیے پُرکشش رہتے ہیں۔ اصل میں، زیادہ آزاد معاشروں میں یہ بات کہ جو دولت ایک نسل نے کمائی ہوتی ہے، وہ تیسری نسل میں کھو جاتی ہے، ایک عام مشاہدے کی بات ہے: لوگ کمپنی قائم کرتے ہیں، اور اپنے خاندانوں کے لیے دولت کماتے ہیں، لیکن جب ان کی تیسری نسل کاروبار میں آتی ہے، تو دوسری کمپنیاں ان سے مقابلے میں آگے نکل چکی ہوتی ہیں۔

یہ زیادہ منصفانہ نظام ہے، اس نظام کے بجائے، جہاں سیاسی اور معاشی طاقت پر

رسائی اشرافیہ کے کنٹرول میں ہوتی ہے، اور وہ اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ اس پر ان کا اور ان کے خاندانوں کا کنٹرول قائم رہے۔ ایک آزاد معیشت میں، جو بھی ذہین ہے اور مضبوط ارادے کا مالک ہے، وہ دولت حاصل کر سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ دوسروں کے خدمت گزار ہوں۔ دولت مند بننے کا موقع ان لوگوں تک محدود نہیں ہوتا، جو ان لوگوں کے دوست، خاندان یا پارٹی والے ہوتے ہیں، جو حکومت میں ہوں، نہ ہی یہ موقع کسی مخصوص نسلی یا مذہبی گروہ کے لیے ہوتا ہے۔ اصل میں، آزاد معاشروں میں سب سے بڑھ کر دولت مند لوگ مہاجر ہیں، جو مختلف تجربات اور تصورات لے کر آتے ہیں اور نئی اشیا یا خدمات پیدا کرتے ہیں، لوگ جنھیں خریدنے کے شوقین ہوتے ہیں۔

سوال: کیا مقابلہ، نفع اور تشہیر، فضول خرچی نہیں؟

جواب: نہیں۔ نفع لوگوں کو کارکردگی، مواقع کی تلاش اور ایسی اشیا اور خدمات پیدا کرنے پر اکساتا ہے، جنھیں دوسرے لوگ اپنی مرضی سے خریدنا چاہیں گے۔ نفع اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وسائل انھی اشیا اور خدمات کو پیدا کرنے کی خاطر استعمال کیے جا رہے ہیں، جنھیں لوگ خود خام وسائل کی نسبت زیادہ قابلِ قدر سمجھتے ہیں۔

تشہیر اہم ہے، کیونکہ یہ لوگوں کو جو نئی اشیا بنتی ہیں، اور موجودہ اشیا میں جو بہتری آتی ہے، اس کے متعلق بتاتی ہے۔ مقابلہ لوگوں کو مختلف اشیا کے درمیان انتخاب کرنے کا موقع دیتا ہے، اور یوں اشیا مہیا کرنے والوں کو جدت لانے اور کم لاگت پر بہتر کوالیٹی کی اشیا بنانے پر مجبور کرتا ہے۔ مقابلے کے بغیر گاہکوں کے پاس کوئی طاقت نہیں ہوگی۔ انھیں وہی کچھ لینا ہوگا، جو اجارہ داری کا حامل مہیا کرنے والا انھیں مہیا کرے گا، یا پھر وہ کچھ نہ خریدیں۔

جہاں جہاں ایک طاقت ور حکومت ہوگی، جو اپنے دوستوں کو فائدے دے سکتی ہے، وہاں وہاں کاروباری لوگ اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ ایسے قاعدے بنوا سکتے ہیں، جو مقابلہ کرنے والوں کو کاروبار میں داخل نہ ہونے دیں، یا ایک مکمل اجارہ داری بنالیں گے۔ گو کہ وہ اس کا جواز یہ کہہ کر دیں گے کہ اس طرح وہ لوگوں کو غیر معیاری اشیا سے بچا رہے ہیں، ان کا حقیقی مقصد مارکیٹ کو کونے میں دھکیلنا ہوتا ہے۔ یہی چیز انھیں ایک جابرانہ طاقت کا حامل بناتی ہے، جو ایک آزاد معاشرے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ حکومتوں کے پاس یہ طاقت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ مارکیٹ کو خراب کرسکیں اور اجارہ داریاں بناسکیں؛ بلکہ ان کا کردار آزادی اور مقابلے کو بڑھانا ہونا چاہیے۔

ایک آزاد معیشت میں کامیابی کا تعلق ہمیشہ سخت محنت سے نہیں ہوتا، گو کہ یہ مدد ضرور دیتی ہے۔ آپ کو وہ اشیا اور خدمات مہیا کرنی ہوں گی، جو دوسرے لوگ چاہتے ہیں اور انھیں خریدنے پر رضا مند ہیں۔ اس کا مطلب خطرہ بھی ہوسکتا ہے، یعنی یہ اندازہ لگانا کہ لوگ کیسی اشیا خریدنا چاہیں گے، اور پھر پیداوار کا پورا سلسلہ تیار کرنا، جس میں بہت سے دوسرے مہیا کرنے والے، کارکن، اور تقسیم کرنے والے شامل ہوں گے۔ نسبتاً کم لوگ ہوتے ہیں، جو یہ خطرے اور ذمے داریاں اٹھانا پسند کرتے ہیں، لیکن ان کاروباریوں کی اصل خدمت، طلب کی کامیاب پیش بینی اور پیداواری نظام، سلسلے اور کوشش کا انتظام ہوتا ہے۔ وہ بڑے بڑے خطرے مول لیتے ہیں، اور اگر لوگ ان کی اشیا کو خریدنے لگتے ہیں، تو انھیں بہت زیادہ صلہ ملتا ہے۔

یہی چیز ہے، جو پیداواریت اور جدت کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ یہ لوگوں کو نئی اور بہتر اشیا اور پروسیس بنانے پر اکساتی ہے، اس امید پر کہ وہ بھی دولت مند بن جائیں گے، جیسے ماضی کے کاروبار دولت مند بنے۔ اور یہ مسلسل بہتری اور ایجاد، گاہکوں کو فائدہ پہنچاتی ہے اور پورے معاشرے کو بھی۔ ایسی ایجادات، جو لوگوں کی محنت کو بچاتی ہیں، یا ان کی زندگی میں بہتری لاتی ہیں، وہ حکومت کی کسی بھی فلاحی سکیم کی نسبت، خوشحالی کو بڑھانے اور دولت کو پھیلانے میں کہیں

بہتر ثابت ہوتی ہیں۔

گاہک اشیا اور خدمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جنھیں وہ کبھی خود تلاش نہیں کر سکتے یا پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً، ایک موثر دوا بنانے اور اسے مہیا کرنے کے لیے بہت زیادہ تحقیق اور مہارت درکار ہوتی ہے۔ بلاشبہ، افراد کے پاس کیمیائی، حیاتیاتی اور صنعتی مہارت کے ہونے کا امکان نہیں ہوتا، لیکن دوا بنانے والی ماہر فرموں کے پاس یہ مہارت ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ مقامی دوا ساز بھی اپنے سٹاک میں موجود شاید پانچ سو دواؤں کے استعمال، ان کے موثر ہونے اور ان کے ضمنی نقصانات کا مخصوص علم سیکھ لیتے ہیں۔ ممکنہ طور پر گاہک ایسا مخصوص علم نہیں سیکھ سکتے، بالکل نہیں، جبکہ انھیں خوراک، مشروب، لباس، شوز اور دوسری تمام چیزوں کا ماہر بھی بننا پڑے، انھیں اپنی روزمرہ زندگی میں جن کی ضرورت پڑتی ہے۔

کاروباری، دولت جمع کر سکتے ہیں۔ مگر وہ دوسروں کی قیمت پر ایسا نہیں کرتے۔ جو پیسہ وہ کماتے ہیں، وہ ان کے گاہکوں کی طرف سے رضا کارانہ انداز میں آتا ہے۔ وہ دوسروں کی مدد کے ذریعے دولت مند بنتے ہیں، لوگوں پر ٹیکس لگا کر نہیں، یا ان کے استحصال سے نہیں۔ اور ان کی دولت اس وقت تک ان کے پاس رہتی ہے، جب تک وہ لوگوں کے خدمت گزار بنے رہتے ہیں۔ کماتے رہنے کے لیے، انھیں اپنے گاہکوں کو سمجھنا پڑتا ہے اور ان کی ضرورتوں کی پیش بینی کرنی ہوتی ہے۔ لہٰذا، وہ ہمیشہ کسی ایسی شے کی تلاش میں رہتے ہیں، جسے ابھی تک مہیا نہیں کیا گیا ہوتا۔ گاہکوں کو مطمئن رکھنے کی کوشش کرتے رہنا، ایک مسلسل عمل ہے۔

نفع اور سٹہ

تو یہ نفعے کی امید ہوتی ہے، جو بڑے اور چھوٹے پیدا کاروں کو تحریک دیتی ہے، خطرہ مول لینے کی، جدت لانے کی، انتظام کرنے کی، اور دوسرے لوگوں کی خدمت گزاری کے لیے کام کرنے کی۔

آزاد معیشتوں کے بہت سے نقاد 'نفعے' کے تصور کو غلط کہتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم

سب نفعے کے طلب گار ہیں۔ ہم ایک چیز کی قربانی دیتے ہیں، تاکہ دوسری چیز حاصل کر سکیں، جسے ہم زیادہ قابلِ قدر سمجھتے ہیں۔ مثلاً، ہم اپنے گھر کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے وقت اور کوشش صرف کرتے ہیں۔ ہم صاف ستھرے گھر کو، اسے صاف ستھرا رکھنے کی کوشش سے زیادہ قابلِ قدر سمجھتے ہیں: اس کا فرق ہمارا نفع ہے۔ یہ کوئی مالی نفع نہیں، مگر دوسرے معاملات میں یہ بالکل ویسے ہی ہے، جیسے کوئی کاروباری کوئی خام مال خریدتا ہے اور کوئی چیز پیدا کرتا ہے، جو اس چیز سے زیادہ پر بکتی ہے، جتنا اس چیز کی لاگت ہے، جس چیز سے اسے بنایا گیا۔ یہاں تک کہ کمیونیٹی یا فلاحی منصوبوں میں شامل ہوتے ہیں، جیسے کہ کسی سکول کے بورڈ میں شامل ہونا، ہم ایسا اپنے مقاصد کی خاطر کرتے ہیں، خواہ یہ مقصد یہ ہو کہ ہم سارے مقامی بچوں کو خوب تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی ہمارے لیے ایک (غیر مالی) نفع ہے۔ مگر نقاد، جس چیز پر توجہ دیتے ہیں اور جسے ناپسند کرتے ہیں، وہ صرف مالی نفع ہے۔ یہ بات غیر منطقی ہے اور مطابقت نہیں رکھتی۔

جب سٹے پر تنقید کی جاتی ہے، تو وہاں بھی یہی بات درست ہے۔ حقیقت میں، سٹہ صرف مالی مارکیٹ تک محدود نہیں۔ ہم سب سٹے باز ہیں۔ کسان اس امید پر بیج بوتے ہیں کہ وہ ایک ایسی فصل اگا رہے ہیں، جو مارکیٹ میں بکے گی۔ ہم تعلیم حاصل کرنے سکول جاتے ہیں، اس امید پر کہ یوں ہمیں روزگار ملنا زیادہ ممکن ہوگا۔ یہ سب سٹہ بازی ہے۔ مالی دنیا میں، سٹہ بہت اہم ہے۔ جہاز کبھی سمندری سفر نہیں کریں گے، اگر انشورینس کمپنیوں اور بیمہ کرنے والے ان جہازوں کے محفوظ سفر سے متعلق سٹے بازی اور خطرہ مول لینے پر تیار نہ ہوں۔ زیادہ تر جدید پیداوار بڑے اور طویل مدتی معاہدوں پر انحصار کرتی ہے، جیسے کہ رسدی معاہدے، یا ایک کارخانہ تعمیر اور اس کا انتظام کرنے کے معاہدے۔ انفرادی پیدا کار معقول طور پر پورا خطرہ نہیں اٹھا سکتے۔ لہٰذا، وہ دوسروں کو اپنے کاروبار کے حصے خریدنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا سٹہ ہے۔ سٹاک مارکیٹ میں، سٹے باز نفع کمانے کی امید پر حصص خریدتے اور بیچتے ہیں، لیکن ایسا کرنے کے لیے، ان کے پاس جن فرموں کے حصص کی وہ تجارت کرتے ہیں، ان سے متعلق ماہرانہ فہم اور مستقبل

میں ان کی کارکردگی کا علم ہونا ضروری ہے۔ یہ مہارت مارکیٹ میں مفید معلومات لاتی ہے، اور قیمتوں کو تیزی کے ساتھ اپنی درست سطح تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے، جس کے بغیر ایسا نہیں ہوگا، اور یوں پوری مارکیٹ کو زیادہ جواب دہ اور موثر بناتی ہے۔

نفع کمانا وہ چیز نہیں، جسے لالچی ہونا کہتے ہیں۔ لوگ نفع کماتے ہیں، خود اپنے ذاتی مفاد کے لیے، لیکن یہ لالچ کی طرح نہیں ہے۔ اگر ہم اپنی بقا چاہتے ہیں، جسمانی نقصان سے بچنا چاہتے ہیں، اور اپنے جسموں کی پرورش چاہتے ہیں، تو ہمارے لیے کچھ نہ کچھ ذاتی مفاد ضروری ہے۔ مگر لالچ، ایک اخلاقی تصور ہے، جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ کوئی شخص حد سے زیادہ ذاتی مفاد کا شکار ہے، جو دوسروں کے لیے نقصان دہ ہے۔ ایک آزاد معاشرے میں، پیدا کار اپنے ذاتی مفاد کو صرف دوسروں کی مدد کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں۔

کاروبار اور تعلقات

گو کہ یہ بہت اہم ہے، مگر کاروبار پوری زندگی نہیں۔ یہاں تک کہ ایک آزاد معاشرے میں بہت زیادہ محنت کرنے والے کاروباری شخص کا بھی خاندان اور دوسرے مفادات ہوتے ہیں، جیسے کہ کھیل یا مشغلے، یا گروہ اور انجمنیں، جن میں وہ جوش و جذبے کے ساتھ حصہ لیتا ہے۔ صرف سرمایہ پسندانہ ملکوں پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، جہاں خاندانی تعلقات نہایت مضبوط ہیں، اور اس سے یہ سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہ خاندان اور مارکیٹ کی معیشت آسانی کے ساتھ اکٹھے چلتے ہیں۔

کاروبار میں ہونے سے اس بات کو جواز نہیں ملتا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بے رحمی سے پیش آیا جائے، اور یقیناً نہ ہی دوسروں کو نقصان پہنچانے کا جواز ملتا ہے، اور 'کسی کو کوئی نقصان نہیں' کا اصول 'اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اور بہت اچھے اور تقویت پہنچانے والے تعلقات میں سے بیشتر تعلقات کام کی جگہ پر کاروباری تعلقات ہوتے ہیں۔ ایک آزاد منڈی کی معیشت سماجی تعلقات کو اور دوسرے طریقوں سے بھی بڑھاوا دیتی ہے۔ اس سے لوگوں

کو دولت اور وقت ملتا ہے، جسے وہ دوسری دلچسپیوں میں صرف کر سکتے ہیں، جیسے کہ مذہبی یا کمیونیٹی تنظیموں اور فلاحی تنظیموں کے مقاصد۔

مارکیٹ کیسے کام کرتی ہے

قیمتوں کا بین الروابطی نظام

بیشتر مارکیٹیں پیسے کے واسطے کے ذریعے کام کرتی ہیں۔ اس کے بغیر براہِ راست تبادلہ ہوسکتا ہے، جیسے کہ اشیا کا تبادلہ یا ادلہ بدلہ؛ مگر پیسہ آسانی پیدا کرتا ہے۔ ایک بیچنے والا اس کے ذریعے کسی شے یا خدمت کا تبادلہ کرسکتا ہے، اور پھر اس کی بہترین قدر حاصل کرنے کی خاطر اس کے بدلے میں دوسری اشیا و خدمات خرید سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بھوکے حجام کو روٹی بنانے والوں کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں، جنھیں بال کٹانے کی ضرورت ہو۔

قیمتوں کو عام طور پر پیسے میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ قیمتیں قدر کا معیار نہیں ہوتیں، کیونکہ قدر ان لوگوں کے ذہن میں موجود ہوتی ہے، جو اس سے تعلق رکھتے ہیں، اور مختلف لوگوں کے لیے ایک ہی چیز کی قدر مختلف ہوتی ہے۔ لیکن قیمتیں، اشیا کے بارے میں لوگوں کی طلب اور ان کی کمیابی سے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور بتاتی ہیں۔ وہ اس نرخ کی عکاسی کرتی ہیں، لوگ جس پر ایک چیز کے ساتھ دوسری چیز کا تبادلہ کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔

کمیابی کے ایک پیمانے کی حیثیت سے قیمتوں کا مقابلہ مشکل ہے۔ اور وہ نہ صرف یہ بتاتی ہیں کہ طلب کہاں زیادہ ہے۔ اونچی قیمتیں رسدکاروں کو اس طلب کو پورا کرنے پر مائل کرتی ہیں۔ اونچی قیمتیں دیکھتے ہوئے، پیداکار ممکنہ نفع حاصل کرنے کی خاطر مارکیٹ میں داخل ہوتے ہیں، اور محنت اور سرمائے کے وسائل کو اس طلب کو پورا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح، نیچی قیمتیں، ظاہر کرتی ہیں کہ طلب کمزور ہے اور یہ کہ وسائل کو کسی اور بہتر جگہ استعمال کیا جائے۔

اس طریقے سے، ایک آزاد معیشت میں قیمتیں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہیں؛ وہ وسائل کو وہاں لے جانے میں مدد کرتی ہیں، جہاں ان کی ضرورت سب سے بڑھ کر ہوتی ہے، اور انھیں وہاں سے ہٹاتی ہیں، جہاں ان کی مقدار زیادہ ہو رہی ہوتی ہے۔ وہ فضول خرچی میں کمی لانے میں بھی مدد کرتی ہیں: سب سے بڑھ کر نفع کمانے کے لیے رسد کاروں کو ایسی چیزیں بنانے کی ضرورت ہوتی ہے، جنھیں بنانے پر کم سے کم لاگت آتی ہو۔ یہ وسائل کی بچت اور یہ یقینی بنانے میں مدد ملتی ہے کہ انھیں ممکنہ طور پر بہترین پیداواری طریقے سے استعمال میں لایا جا رہا ہے۔

یہ اثر ایک مارکیٹ سے لے کر دوسری مارکیٹ تک، پوری معیشت پر، اور اصل میں پوری دنیا تک پھیل جاتا ہے۔ مثلاً فرض کریں کہ ٹین کا کوئی نیا استعمال دریافت کر لیا جاتا ہے۔ یوں اشیا بنانے والے زیادہ ٹین کی طلب کرنے لگتے ہیں۔ وہ اب پہلے کی نسبت ٹین کے لیے زیادہ ادائیگی پر تیار ہوتے ہیں۔ اونچی قیمتیں کانوں سے ٹین نکالنے والی کمپنیوں کو زیادہ ٹین نکالنے پر مائل کریں گی، اور تھوک کا کاروبار کرنے والے اس کی رسد بڑھا دیں گے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ، ٹین کا استعمال کرنے والے دوسرے لوگ اس کا متبادل ڈھونڈنا شروع کر دیں گے، بجائے اس کے کہ وہ اس کی زیادہ قیمت ادا کریں۔ وہ ان متبادل چیزوں کی طلب بڑھا دیں گے، اور یوں ان کی قیمت بڑھ جائے گی۔ یوں متبادل پیدا کرنے والے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہو گی، اور ان متبادل چیزوں کو استعمال کرنے والے ان کے دوسرے متبادل ڈھونڈنے پر مائل ہوں گے۔

اس طریقے سے، قیمتیں، کسی چیز کی کمیابی سے متعلق معلومات پورے معاشی نظام تک پہنچا دیتی ہیں۔ نوبیل انعام یافتہ معیشت دان، ایف اے ہائیک نے اسے 'وسیع بین الروابطی نظام' کا نام دیا، جو مستقل طور پر یہ انکشاف کرتا ہے کہ کہاں زیادتی ہے اور کہاں کمیابی ہے، اور یہ نظام لوگوں کو بتاتا ہے کہ اپنی کوشش اور وسائل کو کہاں لگانا بہترین ہو گا۔

مارکیٹ غلطی سے بری نہیں ہو سکتی

اگر آپ معاشیات کی کوئی نصابی کتاب پڑھیں، تو آپ کو یہ تاثر مل سکتا ہے کہ مارکیٹ

کا انحصار ایک جیسے رسد کاروں کے درمیان 'مکمل مقابلے' پر ہوتا ہے، جو ایک جیسے گاہکوں کو ایک جیسی اشیا بیچتے ہیں۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتے۔ یہ صرف نظری مجردات (تھیوریٹیکل ایبسٹر یکشنز) ہیں۔ حقیقت میں، مارکیٹ اس لیے کامیاب ہوتی ہے کیونکہ لوگ اور پیداکار مختلف ہوتے ہیں۔

اگر ہر کوئی ایک جیسی قدر کو قابلِ قدر سمجھتا ہو، تو کوئی کبھی تجارت نہیں کرے گا۔ اگر دونوں فریق ایک جیس اشیا کو قابلِ قدر سمجھیں گے، تو ان کے تبادلے کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ تبادلہ صرف اس لیے ممکن ہوتا ہے کیونکہ قدر کے بارے میں ہمارے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور ایک مرتبہ پھر، اگر ہر رسد کار ایک جیسی اشیا ایک جیسی قیمتوں پر پیش کرے گا، تو گاہکوں کے پاس ان کے درمیان چننے کو کچھ نہیں ہوگا۔ اور یوں کوئی رسد کار مقابلہ نہیں کرسکتا اور نہ ہی زیادہ نفع کما سکتا ہے۔

لیکن یہ زیادہ سے زیادہ نفع ہوتا ہے، جو کاروباریوں کو مقابلہ کرنے کی تحریک دیتا ہے۔ وہ اپنی اشیا کو سستا بنا کر نفع کماتے ہیں، جیسے پیداوار کو ہموار بنانا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ خود اپنی مخصوص شے کو بہتر بنا کر ایسا کرتے ہیں۔ وہ جدت لاتے ہیں اور اپنی اشیا کو مختلف بناتے ہیں۔ وہ اپنے گاہکوں کو ایسی پرانی اشیا کے بجائے کچھ نئی اور بہتر چیزیں دیتے ہیں، جن کے وہ پہلے عادی ہوتے ہیں۔ اور وہ ان تبدیلیوں کو اس امید پر متعارف کرواتے ہیں، کہ خریدار حقیقتاً انھیں دوسروں کی اشیا پر ترجیح دیں گے۔

یہ چیز آزاد مارکیٹ کو حیران کن طور پر متحرک بناتی ہے، جامد، ساکن اور حرکت کرنے والی نہیں، جیسا کہ نصابی کتابوں کے رسد اور طلب کے گراف بتاتے ہیں۔ رسد کار مستقل طور پر زیادہ پُرکشش اشیا بنانے میں لگے رہتے ہیں، اور گاہک مستقل طور پر بہتری کی تلاش میں رہتے ہیں۔

مرکزی منصوبہ بندی ناممکن ہے

معیشت کو چلانے اور ایسی اشیا پیدا کرنے کی حکومتی کوششیں، جنھیں لوگ چاہتے ہیں، مارکیٹ کے نظام کی حرکت پسندی کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔

حکومتی اجارہ داریوں پر جدت لانے کے لیے دباؤ کم ہی ہوتا ہے۔ نہ ہی حکومتی بیوروکریٹ یہ جانتے ہیں کہ اصل میں لوگ کیا چاہتے ہیں۔ وہ کبھی کبھار لوگوں کی رائے کو جاننے کے لیے جائزے منعقد کروا سکتے ہیں، لیکن مارکیٹ کے مستقل مقابلے کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں، جس میں گاہکوں کی خریداری کے فیصلے ان کی طلب کے بارے میں پیداکاروں کو پل پل کی خبر پہنچاتے ہیں۔

کامیاب ہونے کی خاطر، پیداکاروں کو اپنے گاہکوں کو سمجھنا پڑتا ہے۔ وہ اپنی اشیا کے پلندے کے بارے میں لوگوں کی رائے جاننے کے لیے برسوں انتظار نہیں کر سکتے، جیسا کہ حکومتیں انتخابات کا انتظار کرتی ہیں۔ وہ گاہکوں کی پسند، اور رسد اور خام مال کی لاگت اور دستیابی کے بارے میں جاننے کے لیے ہر وقت چوکس رہتے ہیں۔ مثلاً ایک ایسٹیٹ ایجینٹ کے لیے مقامی پراپرٹی کی مارکیٹ کو جاننا ضروری ہے، اور یہ کہ کونسے ممکنہ خریدار کس قسم کے گھر خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، جیسے کہ صرف ماہوار بنیاد پر نہیں، بلکہ روزانہ کی بنیاد پر، اور ہر گھنٹے کی بنیاد پر بھی۔ کوئی مرکزی طاقت اس قدر تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی معلومات کو حاصل نہیں کر سکتی، اس پر عمل کرنے کی بات ہی نہ کریں، اس سے پہلے کہ یہ معلومات تبدیل ہو جائیں۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کیونکہ ایک آزاد معیشت کی منصوبہ بندی کسی مرکز سے نہیں ہوتی، لہٰذا، یہ لازماً منتشر اور خلافِ عقل ہو گی۔ اصل میں، مارکیٹ نہایت ترتیب کی حامل ہوتی ہیں۔ جائیداد اور تبادلے کے متفقہ قاعدوں پر عمل کرنے سے، لوگ تجارت اور تعاون، اور خاصے یقین کے ساتھ، دوسروں کے اقدام کی پیش بینی کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ مارکیٹ زیادہ عقلی بھی ہوتی ہے۔ وہ لاکھوں افراد کی مقامی مہارت اور علم سے کام لیتی ہے، جو سب خود اپنی اپنی منصوبہ بندی کر رہے ہوتے ہیں اور دوسروں کے بدلتے ہوئے منصوبوں کے پیشِ نظر ان میں مطابقت بھی لا رہے ہوتے ہیں۔ ایک آزاد معیشت میں، کنٹرولڈ معیشت کے بجائے، کہیں زیادہ منصوبہ بندی ہو رہی ہوتی ہے، بس یہ ریاست کی سطح کے بجائے، افراد کی سطح پر ہو رہی ہوتی ہے۔

سوال: کیا آزاد منڈی ماحول کی حفاظت میں ناکام نہیں ہوگئی؟

نہیں۔ مارکیٹ ناکام نہیں ہوئی۔ بہت سی ماحولیاتی اشیا کی کوئی مارکیٹ ہے ہی نہیں۔ مارکیٹ اس وقت بہتر کام کرتی ہے، جب چیزیں کمیاب ہوں، اور جب ادائیگی نہ کرنے والوں کو خارج کیا جاسکتا ہو، اس وقت نہیں جب چیزیں کثرت میں ہوں یا جہاں ادائیگی نہ کرنے والوں کو باہر نہ رکھا جاسکتا ہو۔

تاہم، لوگ اب اس بات کو سمجھنے لگے ہیں کہ ماحولیاتی اشیا کے معاملے میں بھی مارکیٹ نہیں ہوسکتی۔ مثلاً، بجائے اس کے کہ سمندر میں دستیاب مچھلیوں کے ذخیرے کو تباہ ہونے دیا جائے، معتد بہ ملکوں نے اب ایک پائیدار حد مقرر کردی ہے اور مچھلیوں کے کل ذخیرے کے ایک حصے کو پکڑنے کے اجازت نامے جاری کرتے ہیں۔ یہ اجازت نامے قابلِ تجارت ہیں، اور ایک مارکیٹ فوراً وجود میں آجاتی ہے، اور یوں کارکردگی کو فروغ ملتا ہے، جبکہ ذخیرہ بھی بڑھتا رہتا ہے۔

اور جیسے جیسے لوگ، آزاد معیشت کی بدولت، دولت مند بنتے ہیں، تو وہ اتنا ہی زیادہ ماحول کی دیکھ بھال کے قابل بھی ہوسکتے ہیں۔ چین اپنی صنعتوں سے شدید آلودگی کا شکار ہے، لیکن وہاں لوگ بنیادی معاشی ترقی کو صاف ہوا کے تعیش کی نسبت زیادہ قابلِ قدر سمجھتے ہیں۔ جیسے جیسے وہ دولت مند بنیں گے، ہر دولت مند ملک کی طرح، وہاں بھی معیارات تبدیل ہوں گے اور وہ صاف ستھرے صنعتی عمل کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہوجائیں گے، جو کم آلودگی کا سبب بنتے ہیں۔

ریاست کی سرپرستی میں کاروبار

آج چند ہی ریاستیں ہیں جو یہ سمجھتی ہیں کہ وہ اپنی قوم کی کل پیداواری سرگرمی کی مالک بن سکتی ہیں اور موثر طور پر اس کا انتظام کرسکتی ہیں۔ دنیا کی بیشتر معیشتیں 'مخلوط' معیشتیں ہیں، جہاں حکومتیں صرف کچھ صنعتوں کی مالک ہوتی ہیں، اور منصوبہ بندی، قاعدہ سازی، سبسڈی، ٹیکسوں اور ریاست کی حصہ داری کے ذریعے، دوسروں کی پیداوار کی نگرانی اور انتظام کرتی ہیں۔

بیسویں صدی میں بیشتر ملکوں میں صنعتی شعبے کو قومیا لیا گیا، جسے حکمتِ عملی کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل مانا گیا، اور بہت سے ملک ابھی تک ان صنعتوں کے مالک ہیں اور ان پر کنٹرول رکھتے ہیں، جس میں ٹیلی کمیونیکشن، ٹرانسپورٹ، بینکنگ، یوٹیلیٹی، کان کنی، اور بہت سے دوسرے شعبے شامل ہیں۔

بدقسمتی سے، ان صنعتوں کی ریاستی ملکیت قریب قریب ہمیشہ حکومتی اجارہ داریوں کو جنم دیتی ہے۔ ایسی اجارہ داریاں اکثر اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ موثر انتظام ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک اجارہ داری سرکاری ہے یا نجی: بہرصورت یہ پھیلتی جاتی ہے اور سست بن جاتی ہے اور بہت زیادہ لاگت پر بری خدمت مہیا کرتی ہے۔

یہ صنعتیں، حکمتِ عملی کے اعتبار سے اہم ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ریاست کی ملکیت ہوں۔ بیشتر دولت مند ملکوں کے بینک نجی ملکیت میں ہیں: اصل میں انھیں ریاستی ملکیت بنانے سے وہ اور وہ کاروبار اور وہ خاندان، جن کا ان پر دارومدار ہے، جلد ہی تباہ ہو جائیں گے۔ تجارتی کمپنیاں، جو حکومت کے رسدکار کے طور پر کام کرتی ہیں، یا براہِ راست صارفوں کے ساتھ کام کرتی ہیں، اب ٹیلی کمیونیکشن، ٹرانسپورٹ، اور یوٹیلیٹی سے متعلق دنیا بھر کی بیشتر خدمات مہیا کرتی ہیں۔ بیشتر ملکوں نے اپنی ریاستی ملکیتی کمپنیوں کی نجکاری کر دی ہوئی ہے؛ انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ مقابلہ کرنے والی فرمیں ان اہم خدمات کو بہتر طور پر مہیا کر سکتی ہیں، جو نجی انتظامی مہارت اور نجی سرمائے کو کام میں لاتی ہیں۔

تاہم، حکومتوں نے سیکھا ہے کہ وہ صنعتوں کو اپنی ملکیت میں رکھے بغیر اپنے کنٹرول میں رکھ سکتی ہیں۔ وہ کسی اہم کمپنی (اور نام کی نجی ملکیتی کمپنی) میں حصہ داری خرید لیتی ہیں، اور یوں اپنی حصہ داری کے حقوق کے بل پر کمپنی جو کچھ کرتی ہے اور اپنے بورڈ میں کس کا تقرر کرتی ہے، ان چیزوں کو کنٹرول کرتی ہے۔ بعض اوقات وہ خود کو ''سنہری حصص'' کا مالک قرار دے لیتی ہیں، جو انھیں بنیادی معاملات پر حرفِ آخر کا مرتبہ دے دیتے ہیں۔

ایک آزاد معاشرے میں اس طرح کی قابضانہ مداخلت کو مسترد کر دیا جائے گا۔ اس کا مطلب ہے ریاستی ملکیت اور ضبطی، جو حکومتوں کو صنعتوں کو خریدے بغیر ان کے فیصلے کرنے کی اجازت دے دیتی ہے۔ یوں جو مالک ہوتے ہیں، جن میں عام لوگ شامل ہوتے ہیں، جو اپنی بچتوں اور پینشن کو اچھی ساکھ کی کمپنیوں میں لگاتے ہیں، ان کی ملکیت کو بھی لوٹا جاتا ہے۔ اور کرپشن کے مواقع بھی بڑھ جاتے ہیں، حواریوں کو بورڈ پر پُرکشش پوزیشن دی جاسکتی ہیں، کارخانوں کو پسندیدہ علاقوں میں لگایا جاسکتا ہے، اور پیداوار کو حامیوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

حکومتیں، قاعدوں اور ضابطوں کے ذریعے بھی نجی کمپنیوں کا موثر کنٹرول سنبھال سکتی ہیں۔ ضابطے کمپنیوں کے کام کرنے پر قدغن لگا سکتے ہیں، اور انھیں ہدایات دے سکتے ہیں کہ وہ کیا پیدا کریں، وہ کتنی قیمت مقرر کر سکتے ہیں، وہ سرمایہ کاری کہاں کریں اور نوکریاں کہاں تخلیق کریں، اپنے کارکنوں کو کیا ادائیگی کریں، اور اسی طرح کی بہت سی چیزیں۔ ان ملکوں میں بھی، جو خود کو آزاد کہلواتے ہیں، نجی وسائل کا اس قسم کا کنٹرول بہت عام ہے، لیکن یہ نجی ملکیت کے اصول کے بالکل خلاف ہے، جو ایک حقیقی طور پر آزاد معاشرے کی لازمی بنیادوں میں سے ہے۔

بین الاقوامی تجارت

تجارت بمقابلہ تحفظ پرستی

افراد کے درمیان آزاد تجارت سے ایک ہی ملک میں جو فائدے جنم لیتے ہیں، وہ فائدے اس وقت بھی جنم لیتے ہیں، جب لوگ بین الاقوامی سرحدوں کے پار تجارت کرتے ہیں۔ تجارت، قوموں کو اس چیز میں مہارت حاصل کرنے، جس چیز کو وہ بہترین طریقے سے کر سکتے ہیں، اور اپنی زائد پیداوار کو دوسرے ملکوں میں بھیجنے کا موقع دیتی ہے، جو دوسری چیزیں بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔ مثلاً دنیا بھر کے پھولوں کا ایک بہت بڑا حصہ کینیا سے آتا ہے، جہاں

انھیں اگانے کے لیے مٹی اور ماحول سازگار ہے؛ جبکہ چلی، آسٹریلیا اور فرانس شراب بنانے والے سرکردہ پیداکاروں کے طور پر مشہور ہیں، اس کا سبب ان کی زمین اور ماحول کے حالات ہیں اور وہ مہارت بھی، جو وہ حاصل کر چکے ہیں۔ بھارت، نسبتاً اپنے سستے مگر تعلیم یافتہ محنت کاروں کی وجہ سے آئی ٹی خدمات اور پیداوار میں ایک اہم ملک بن چکا ہے۔ بین الاقوامی تجارت لوگوں کو ایک خاص شعبے میں مہارت حاصل کرنے اور سرمایہ تشکیل دینے کے قابل بناتی ہے، جیسے کہ آلات اور اوزار، جو پیداوار کی لاگت کو گھٹاتے اور اسے موثر بناتے ہیں۔

اور کیونکہ غالباً لوگوں کی اقدار کے درمیان ایک ہی ملک میں جتنا اختلاف ہوتا ہے، مختلف ملکوں کے لوگوں کی اقدار میں زیادہ گہرا اختلاف ہوتا ہے، اسی لیے تجارت کے ذریعے باہمی فائدہ اٹھانے کے ممکنہ مواقع زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ مثلاً، زمانۂ وسطیٰ میں، یورپی سیاح، جیسے کہ چائے جیسی اشیا کی بہت زیادہ قیمت دیتے ہوں گے، جو بھارت اور چین میں آسانی اور کثرت سے پیدا ہوتی تھی، یا مسالحوں کے لیے بھی، جو مشرقِ وسطیٰ میں سستے اور عام تھے۔ آج، لوگ وینس کے طرزِ تعمیر یا تھائی لینڈ کی ثقافت کو دیکھنے کے لیے دنیا کا نصف سفر اختیار کرتے ہیں، اور تعجب کرتے ہیں کہ وہ ان کے اپنے ملکوں سے کتنا مختلف ہیں۔

ایک آزاد معاشرہ، تمام ملکوں میں اشیا کے لیے کھلا ہوتا ہے۔ یہ تجارت کے بہترین فائدوں اور اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ تجارت خوشحالی کو بڑھانے میں کیسے مدد کرتی ہے۔ اس کا متبادل تحفظ پرستی ہے، جس کی رو سے ملک، دوسرے ملکوں کی اشیا کی درآمد کو بند کر کے، خود اپنے رسد کاورں کو تحفظ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں ملکی رسد کاروں کو خوب فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن یوں ملکی صارفوں کو بہتر یا سستی اشیا اور خدمات نہیں ملتیں، جو باہر ملکوں سے آتی ہیں۔ وہ ان ملکی پیداکاروں کی تحفظ دی ہوئی اشیا کی اونچی قیمت ادا کرتے ہیں، ان کے پاس انتخاب کم ہوتا ہے، اور انھیں بیکار اشیا سے کام چلانا پڑتا ہے۔

تحفظ پرستی فضول خرچی ہے

جب کوئی ملک کوئی شے گھریلو طور پر پیدا کرتا ہے، جسے باہر ملک میں بہتر اور سستا پیدا کیا جا سکتا تھا، تو یہ وسائل (ماحولیاتی وسائل سمیت) کا ضیاع ہے۔ ایڈم سمتھ نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ سبز گھروں (گرین ہاؤس) کے ذریعے، ٹھنڈے، بارشی سکاٹ لینڈ میں انگور اگائے جا سکتے ہیں، جبکہ فرانس میں جہاں فطری دھوپ ہوتی ہے، وہاں انھیں اگانے پر تیس گنا زیادہ خرچ اٹھتا ہے۔ تو پھر وسائل، یعنی آپ کا وقت، پیسہ اور محنت ضائع کیوں کی جائے، ایک ایسا کام خود کرنے پر، جبکہ کوئی اور اس کام کو بہتر یا زیادہ سستے طور پر کر سکتا ہے؟

اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ جو پیداکار زیادہ کارکردگی دکھاتے ہیں، وہ پابندیوں، کوٹے اور ٹیرف کے ذریعے اپنی اشیا کو دوسرے ملکوں میں بھیجے جانے پر عائد رکاوٹوں پر مایوسی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کے بدلے میں وہ خود اپنی طرف سے بھی رکاوٹیں کھڑی کر سکتے ہیں۔ تجارتی جنگوں سے کسی کو فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر تمام رکاوٹیں دور کر دی جائیں اور لوگوں کو جیسے وہ چاہتے ہیں، اس طرح تجارت کرنے دی جائے، تو یہ کہیں زیادہ اچھا ہے، بلکہ یہ دونوں ملکوں کے غریب باسیوں کے لیے بھی بہت اچھا ہے، جنھیں سستی درآمدات کے ذریعے فائدہ ہی ہوتا ہے۔

ہجرت کے بارے میں بھی یہ بات درست ہے۔ ایک آزاد معاشرے میں حکومت ملکوں کے درمیان لوگوں کے سفر پر پابندیاں نہیں لگاتی۔ ہجرت کرنے والے توانائی اور نئے تصورات ساتھ لاتے ہیں، جن سے ان ملکوں کو فائدہ ہوتا ہے، جہاں وہ جاتے ہیں۔ مثلاً، یورپ اور شمالی امریکہ میں ہجرت کرنے والوں نے بے حد خوشحالی کو جنم دیا۔ وہ پابندیاں، جو دہائیوں سے لگی ہوئی ہیں، انھیں ہٹانا آسان نہیں، اور شدید مسائل پیدا کر سکتی ہیں، جو عارضی ہوتے ہیں: لیکن جو لوگ آزاد معاشرے پر یقین رکھتے ہیں، یہ بات ایک آخری مقصد کے طور پر ان کے ساتھ رہنی چاہیے۔

آزاد تجارت عمل میں

جن ملکوں میں کھلی تجارت کا نظام رائج ہوتا ہے، وہ ان ملکوں کی نسبت، تیزی سے ترقی کرتے ہیں اور زیادہ خوشحال بن جاتے ہیں، جہاں یہ نظام رائج نہیں ہوتا۔ چھوٹے تجارتی شہروں، جیسے کہ ہانگ کانگ اور سنگاپور پر نظر ڈالیے، ان میں سے کسی کے پاس اپنی مدد کے لیے زیادہ فطری وسائل نہیں۔ 1960ء کی دہائی میں، وہ اتنے ہی غریب تھے، جتنا بیشتر افریقی اور کیریبین کے ملک غریب تھے، جن کے پاس بے حد وسائل دستیاب تھے۔ آج، تجارت اور معاشی آزادی کی بدولت، وہ کئی گنا دولت مند ہیں۔

تجارت کے پھیلاؤ نے دنیا میں غربت کو بہت بڑے پیمانے پر کم کر دیا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ خوف ہے کہ اگر درآمدات، اور خاص طور پر غیر ملکی سرمایہ کاری کی اجازت دی جائے گی، تو اس کا نتیجہ مقامی آبادیوں کے استحصال کی صورت میں نکلے گا، جیسے کہ 'سویٹ شاپ' (بیگار خانہ) ہوتی تھیں، جہاں جوتے اور کپڑا بنایا جاتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ کوئی کسی کو کارخانوں میں کام کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتا؛ لیکن بیشتر لوگ جلتے سورج کے نیچے کھیتوں میں کمر توڑ محنت کے بجائے، جہاں انھیں ملنے والا صلہ غیر یقینی اور کم ہوتا تھا، کارخانوں میں کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، جہاں انھیں باقاعدگی کے ساتھ اجرت ملتی ہے۔ ویٹ نام جیسے ملکوں میں جہاں غیر ملکی سرمایہ کاری ہونے لگی ہے، کارخانوں میں کام کرنے والے محنت کش اب سکوٹر، ٹیلی وژن اور دوسری تعیّشات کا مالک بننے کے قابل ہونے لگے ہیں، پہلے وہ جس کا خواب بھی نہیں دیکھتے تھے۔

آج، قریب قریب ہر نفیس شے، جیسے کہ موبائل فون یا دستی کمپیوٹر کے لیے وسائل، مہارتیں، اور باریک بینی درکار ہوتی ہے، جنھیں پوری دنیا سے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ ڈیزائن کرنے والے ہوسکتا ہے کیلیفورنیا میں رہتے ہوں، لیکن انھیں بنانے کے کام کا انتظام ہانگ کانگ میں کیا جاتا ہوگا، اور ان کی تکمیل چین میں ہوتی ہوگی۔ اس میں جو دھاتیں اور دوسری چیزیں استعمال ہوتی ہیں، ہوسکتا ہے ان کی کان کنی ایشیا، آسٹریلیا، یا جنوبی امریکہ میں ہوتی ہو۔ اور ان اشیا کو اگر بحری

جہازوں میں بھیجا جاتا ہے،تو وہ یونان سے تعلق رکھتے ہوں، یا اگر ہوائی جہاز ہیں،تو وہ نیدرلینڈ سے تعلق رکھتے ہوں۔اور یقیناً انھیں استعمال کرنے والے تو پوری دنیا میں پھیلے ہیں۔

جیسا کہ لوگ دوسرے ملکوں کے لوگوں کے ساتھ تجارت کرتے ہیں، وہ انھیں بہتر طور پر سمجھنے لگتے ہیں، یا کم از کم ان کا احترام کرنے لگتے ہیں۔تاجروں کے لیے خود کو دوسری قوموں یا نسلوں کے لوگوں سے برتر سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔خود فائدہ اٹھانے کی خاطر، انھیں دوسروں کے ساتھ، رسدکار، یا شریکِ کار یا گاہک کے طور پر، پُر امن طریقے سے تجارت کرنی ہوتی ہے۔ بین الاقوامی تجارت، افہام و تفہیم اور امن کو جنم دیتی ہے، جس کے خود اپنے وسیع تر فائدے ہیں۔اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ زیادہ تر آزاد اور کھلے معاشرے وہ ہیں، جہاں آزاد اور کھلی تجارت سب سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

چھٹا باب

ملکیت اور انصاف

چوتھے باب میں ہم نے دیکھا کہ 'انصاف' کا ایک مخصوص مفہوم ہے، یعنی لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح احترام کے ساتھ پیش آنا چاہیے، بجائے اس کے کہ ان کے عمل کا صلہ ان کے درمیان کس طرح تقسیم ہونا چاہیے۔ لیکن وہ قاعدے، جو اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ کیسے پیش آنا چاہیے، بہت پیچیدہ ہیں۔ طرزِ عمل سے متعلق ان قاعدوں کو باقی رکھنے اور ان کا نفاذ کرنے کے لیے کچھ قدروں اور سماجی اداروں کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے کہ ملکیت، قانون کی حاکمیت اور دوسرے لوگوں کے حقوق کا احترام۔

نجی ملکیت

ملکیت کا مفہوم

یہ چیز کہ لوگ جائیداد کے مالک ہو سکتے ہیں، ایک آزاد معاشرے کی زندگی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جائیداد کی ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کسی چیز کو اپنے پاس اور اپنے کنٹرول میں رکھنے کے قابل ہیں، اور یہ چیز زیادہ اہم ہے، کہ آپ کو یہ حق ہے کہ آپ دوسروں کو اس میں سے نکال دیں۔ آپ اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں، اسے کرائے پر دے سکتے ہیں، بیچ سکتے ہیں، کسی کو دے سکتے ہیں، یا اسے تباہ کر سکتے ہیں، لیکن دوسرے لوگ اسے آپ سے آپ کی اجازت کے بغیر نہیں لے سکتے۔ آپ کی ملکیت ناجائز طریقے سے آپ سے علاحدہ نہیں کی جا سکتی۔

افراد، جائیداد کے مالک ہو سکتے ہیں، اسی طرح، گروہ بھی، جیسے کہ شادی شدہ جوڑے، کاروباری شراکتیں، اور کارپوریشنیں، اور حکومتیں اور عوامی انجمنیں۔

جائیداد، ہمیشہ کوئی طبیعی چیز اور قابلِ انتقال نہیں ہوتی، جیسے کہ زمین یا عمارت۔ یہ ایک ایسی چیز ہو سکتی ہے، جو قابلِ انتقال ہو، جیسے کہ فارمی جانور، ٹرک، یا کوئی لباس۔ یہ غیر طبیعی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ فکری (انٹیلیکچول پراپرٹی) ملکیت بھی ہو سکتی ہے، جیسے کہ کسی چیز کا ٹریڈ مارک، یا کاپی رائٹ، جو آپ نے لکھی یا ریکارڈ کی، یا کسی چیز کا پیٹینٹ، جو آپ نے ڈیزائین کی ہو۔ اس میں کسی کمپنی کے حصص شامل ہو سکتے ہیں، یا کسی نے آپ کا جو قرض ادا کرنا ہو، یا آپ کی بچت۔ یہ کسی مخصوص عرصے کے لیے کسی کی زمین پٹے پر لینا ہو سکتا ہے، یا کسی ریڈیو سٹیشن کا ایک مخصوص فریکوینسی کے استعمال کا حق۔ لہٰذا، ملکیت ضروری نہیں کہ کوئی جامد اور طبیعی چیز ہی ہو۔

ملکیت کو تخلیق بھی کیا جا سکتا ہے۔ ٹرک یا لباس ایک ایسی چیز ہوتی ہے، جنھیں مختلف چیزیں جوڑ کر ایک نئی چیز کی صورت دی جاتی ہے۔ ایک فارمی جانور کو پال پوس کر بڑا کیا جاتا ہے۔ لوگ نئی کتابیں لکھتے ہیں، یا بچتوں کا ایک نیا پیکیج پیش کرتے ہیں۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے لاتعداد موبائل فون چینل کی تخلیق کو آسان کر دیا ہے، جو کہ ملکیت کی ایک بالکل نئی قسم ہے۔

یہ چیز بھی اہم ہے کہ آپ کی ملکیت میں آپ کے جسم پر آپ کے حقوق اور خود آپ کی اپنی محنت سے لطف اٹھانے سے متعلق حق بھی شامل ہے۔ ایک آزاد معاشرے میں، آپ کو بغیر کسی مناسب وجہ کے نہ تو گرفتار کیا جا سکتا ہے، نہ قید۔ آپ کو جائز طور پر کسی اور کے لیے کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی جو کچھ آپ نے خود اپنی مہارت، ذہانت، علم یا کوشش سے تخلیق کیا ہے، دوسروں کو اسے چرانے کی اجازت دی جاتی ہے۔

ملکیت اور ترقی

ملکیت کا ادارہ اتنا ہی پرانا ہے، جتنا انسانیت، گو کہ کبھی اس کا احترام نہیں کیا گیا۔ حالیہ طور پر، روس اور چین جیسے ملکوں نے فارموں اور کارخانوں کی اجتماعی ملکیت کا تجربہ کیا ہے۔ لیکن یہ

صرف جدید تجارت کے سامنے آنے کے بعد ممکن ہوا کہ نجی ملکیت اور اس کی حفاظت کو بتدریج قبول کیا گیا، جس کی وجہ سے تجارتی قوموں کی میں دولت میں بے بہا اضافہ ہوا۔

یہ سمجھنا آسان ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ ماحولیات دان، گیریٹ ہارڈِن نے 'اجتماعی المیے' (ٹریجیڈی آف دا کامنز) کے بارے میں لکھا ہے۔ جب لوگ کسی وسیلے کے مالک ہوتے ہیں، تو وہ اسے محفوظ رکھنے اور اس کی دیکھ بھال میں کہیں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ اس کے مالک نہ ہوں۔ جس زمین کی ملکیت نجی ہوتی ہے، اس پر بہتر کاشت کاری کی جاتی ہے، بجائے اس کاشت کاری کے جو اجتماعی طور پر کی جاتی ہے۔ گھروں کے بلاکس کی مشترکہ سیڑھیاں اور زینے اکثر گندے اور خستہ حال ہوتے ہیں، اگرچہ انفرادی گھروں کو بہت اچھی حالت میں رکھا جاتا ہے۔ لوگ اس بات کو نہیں سمجھ پاتے کہ وہ کسی ایسی چیز پر اپنا وقت اور محنت کیوں صرف کریں، جس کے وہ مالک نہیں، کیونکہ اگر وہ کچھ کام کریں بھی، تو اس کا فائدہ دوسرے لوگوں کو ہوگا۔

ملکیت کی حفاظت اور جائیداد کی ملکیت کا احترام، لوگوں کو پیداواری سرمائے کی تشکیل کے قابل بناتے ہیں۔ کسان زیادہ توجہ سے بیج بوتے ہیں، فصلوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، اور ٹریکٹر خریدتے ہیں، اگر حاصل ہونے والی فصل ان کی ملکیت ہو۔ کاروباری لوگ کارخانوں، آلات اور پیداواری سلسلوں میں سرمایہ کاری کرنے پر زیادہ مائل ہوتے ہیں، اگر وہ یہ فیصلہ کر سکتے ہوں کہ اس ملکیت کو کیسے استعمال کیا جائے گا، اور وہ یہ جانتے ہوں کہ کسی دوسرے کو اسے لے لینے کا کوئی حق نہیں۔ اگر ملکیتی حقوق کو تحفظ حاصل ہے اور ان کا احترام کیا جاتا ہے، تو لوگ پیداواری سرمائے کی تشکیل کرتے ہیں، اور یوں پیداواریت بڑھتی ہے، جو پورے معاشرے کے لیے مددگار ہوتی ہے۔ لیکن اگر ملکیت کو دوسرے لوگ چرا، یا تباہ کر سکتے ہوں، یا کوئی اور ان چیزوں کو لے سکتا ہے، جو اس ملکیت کی مدد سے پیدا ہوتی ہیں، تو لوگوں کے لیے اس کی پیداوار میں اپنی مہارت، وقت، پیسہ، محنت اور قابلیت لگانے کی کوئی ترغیب باقی نہیں رہتی، اور یوں پورے معاشرے کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

ملکیت اور دوسرے حقوق

ایک آزاد معاشرے میں لوگوں کو جو حقوق اور آزادیاں دستیاب ہیں، ان کی جڑیں ملکیت کے ادارے میں پیوست ہیں۔ نجی ملکیت کے بغیر، نہ تو کوئی حقوق ہو سکتے ہیں، نہ کوئی آزادی۔

مثال کے طور پر لوگوں کا اظہارِ رائے، دوسروں کے ساتھ مل کر انجمن سازی، اور سیاسی عمل میں حصہ لینے کا حق۔ اگر نجی ملکیت نہ ہو، جیسے کہ تمام وسائل کسی حکومت کے کنٹرول میں ہوں، تو امیدوار اپنی انتخابی مہم کیسے چلائیں گے؟ اپنے پیغام کو پہنچانے کے لیے، انھیں جلسے کے ہال کرائے پر لینے ہوں گے، اشتہار چھاپنے ہوں گے، اور اپنے نظریات نشر کرنے ہوں گے۔ لیکن اگر تمام جلسہ گاہیں حکومت کی ملکیت میں ہوں، چھپائی اور کاغذ کی رسد حکومت کے کنٹرول میں ہو، اور نشریاتی ذرائع حکومت کی ملکیت میں ہوں، تو یہ کسی کی مہم کو بھی موثر طور پر روک سکتی ہے۔ (اصل میں، اگر کوئی امیدوار حکومت اور اس کی پالیسیوں پر تنقید کرتا ہے، تو اس بات کا بہت امکان ہے۔) اس سے بھی بدتر یہ کہ اگر لوگ خود نجی ملکیت کے حامل نہ ہوں، تو حکومت کے لیے اپنے ناقدوں کو گرفتاری یا قتل کے ذریعے خاموش کرانا کوئی مشکل نہیں ہو گا۔ (یہ چیز افسوسناک ہے، مگر اس کی مثالیں بہت عام ہیں۔)

ملکیت کے بغیر، انصاف بھی ممکن نہیں۔ اگر خود آپ کے جسم پر آپ کا حق نہیں، آپ کی محنت اور آپ کی ملکیتیں، انھیں بغیر تلافی کے آپ سے چھینا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کے جسم پر آپ کا حق نہیں، تو آپ کو بغیر کسی کے وجہ کے گرفتار اور قید اور قتل کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کی محنت پر آپ کا حق نہیں، تو آپ کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کی ملکیتوں پر آپ کا حق نہیں، تو آپ کو لوٹا جا سکتا ہے۔ اور آپ کے پاس ناانصافی کے خلاف کوئی تحفظ نہیں ہو گا۔

ملکیت کے اخلاقی فائدے

ملکیت اور ملکیتی حقوق کی حفاظت، افراد کو حکومت اور دوسروں کے جبر کے خلاف ایک اہم تحفظ مہیا کرتے ہیں۔ ملکیت کا مالک ہونا، افراد کو خود اپنی حفاظت، اور خود اپنے فیصلے کرنے،

اپنے منصوبے بنانے، اپنی خواہشوں کو پورا کرنے یا خود اپنے نظریات کے اظہار کے قابل بناتا ہے، اور یوں کہ دوسرے، خواہ یہ حکومت ہو یا افراد، بغیر کسی وجہ کہ آپ کو جو وہ کرنا چاہیں، اس کا شکار نہیں بنا سکتے۔

ملکیت، اور اس سے سامنے آنے والے تجارت اور تبادلے کے قاعدے، افراد کو اپنے باہمی فائدے کی خاطر پُر امن طریقے سے تعاون کے قابل بناتے ہیں۔ یہ انھیں، تنازعات، تشدد اور جبر کے بغیر، متفقہ قاعدوں کے مطابق، ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے، قدرتی وسائل اور اپنی محنت کے پھل کو ایک دوسرے کے ساتھ بانٹنے کے قابل بناتے ہیں۔

ملکیت نہ صرف پُر امن تعاون کو بڑھاوا دیتی ہے، یہ تعاون کو ہر کسی کے لیے ضروری بناتی ہے، جو خود اپنے حالات کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔ لوگ طاقت کے ذریعے جو کچھ چاہتے ہیں، وہ حاصل نہیں کر سکتے۔ ملکیت کو منتقل کیا جا سکتا ہے، بیچا جا سکتا ہے، کرائے پر دیا جا سکتا ہے، بانٹا جا سکتا ہے، پٹے پر دیا جا سکتا ہے، یا کسی کو عطا کیا جا سکتا ہے، مگر صرف مالک کی مرضی کے ساتھ۔ زیادہ آزاد معاشرے اس اہم حق کی حفاظت کرنے کے لیے ٹھوس میکانزم کے حامل ہیں، جیسے کہ قرضوں کی ادائیگی اور معاہدوں پر عمل درآمد سے متعلق قاعدے۔ آزاد لوگوں کے نزدیک، یہ وسائل کی منتقلی کا زیادہ اخلاقی طریقہ ہے، بجائے اس کے کہ انھیں طاقت کے ذریعے لے لیا جائے، یا چوری اور دھوکے کے ذریعے۔

معاشرے کے ساتھ مفاد کی وابستگی

یہ نہ صرف وہ لوگ ہیں، جو ملکیت کے حامل ہوتے ہیں، جنھیں ان سب چیزوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ سرمایہ کاری، سرمائے کی تشکیل اور تجارت کے فروغ کے ذریعے، پورے معاشرے کو فائدہ ہوتا ہے۔ مثلاً، شہروں کے باسیوں کو، جن کے پاس خود اپنی کوئی زمین نہیں ہوتی، کسانوں کی بدولت خوراک ملتی ہے، جو اپنی فصلوں کو اگاتے اور گاہکوں کے ساتھ رضا کارانہ طور پر ان کی تجارت کرتے ہیں، یہی ان کی ترغیب ہوتی ہے۔ اور اس کا سبب کسانوں کا اپنی زمین اور اپنی

فصلوں کی ملکیت کا حق ہے۔ اور اس کا نتیجہ ان ملکوں کے بالکل برعکس ہوتا ہے، جہاں ملکیتی حقوق کو تحفظ حاصل نہیں، جیسے کہ رابرٹ موگابے کا زمبابوے، جہاں لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ پہلے سے کام کرتے ہوئے کسانوں کی زمینوں کو خود اپنی سمجھ کر ہتھیا لیں۔ جیسا کہ پہلے سے موجود (بیشتر گورے) کسان فرار ہو گئے، اس کا نتیجہ زیادہ خوشحالی کی صورت میں نہیں نکلا، بلکہ کم خوشحالی کی صورت میں نکلا: ملکیت کے واضح قاعدوں کے بغیر، پیداوار گھٹ گئی، اور شہر کے باسیوں کو خوراک کی شدید کمی کا شکار ہونا پڑا۔

اسی لیے ایک آزاد معاشرے میں، لوگوں کے ملکیتی کے حقوق کا تحفظ حکومت کا ایک اہم فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ یوں لوگوں کو مجرموں اور طاقتور یا دولت مند اشرافیہ کے جبر سے تحفظ ملتا ہے۔ نجی ملکیت کے ادارے سے ہر کسی کا مفاد معاشرے اور پُرامن تعاون کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ ہر کسی کو ملکیتی حقوق سے فائدہ ہوتا ہے، جو ملکیتی وسائل کے بہتر انتظام اور بہتر استعمال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اور یوں پیداواری سرمائے کی تشکیل بھی ہوتی ہے اور تعمیر بھی۔ ایک آزاد معاشرے میں ملکیت کوئی خصوصی مراعت نہیں، جو چند ایک کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہر کسی کے لیے کھلی ہوتی ہے، اور ہر کوئی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

انصاف کے قاعدے

انصاف کا حصول

انصاف ان قاعدوں پر منحصر ہوتا ہے، جن کے ذریعے جزا اور سزا کا تعین ہوتا ہے۔ یہ ہمارے اس مشترک انسانی احساس پر مبنی ہوتا ہے کہ لوگوں کے اعمال کا کیا نتیجہ ہوتا ہے اور انھیں کس چیز کا مستحق بناتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی ارادہ کر کے کسی کو نقصان پہنچاتا ہے، تو بیشتر لوگ اس پر اتفاق کریں گے کہ جس شخص کا نقصان ہوا ہے، نقصان پہنچانے والے کو اس کی تلافی کرنی چاہیے اور اسے اپنے جرم کی سزا ملنی چاہیے۔

انصاف کے قاعدے کوئی ایسی چیز نہیں ہوتے ،جنھیں ہم خود اپنے لیے بنا سکتے ہیں۔ یہ ہماری فطرت کا حصہ ہیں۔ کچھ لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ 'فطری قانون' ہمیں ہمارے خالق کی طرف سے عطا ہوا ہے اور ہمارا مذہب ہمیں اسے کے بارے میں بتاتا ہے۔ دوسروں ، جیسے کہ نوبیل انعام یافتہ معیشت دان اور فلسفی ، ایف اے ہائیک کا نظریہ ارتقا پر مبنی ہے۔ وہ دلیل دیتا ہے کہ انصاف کے قاعدے ہمارے ساتھ ہی بڑے ہوئے ہیں کیونکہ یہ سماجی مخلوق کی حیثیت سے ہمیں مل جل کر رہنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی سامنے آئے ہوں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں انصاف کے فطری احساسات موجود ہیں، جو تعاون اور ایک کامیابی سے چلنے والے انسانی معاشرے کے فروغ میں مدد دیتے ہیں۔ اگر ہم میں کوئی ایسے احساسات نہ ہوتے اور نہ ہی ناانصافی کا احساس ہوتا، جیسے کہ جب لوگوں کو لوٹا جاتا یا قتل کیا جاتا اور اگر ہم کوئی قدم نہ اٹھاتے ،تو ہم زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

اسی لیے ایک آزاد معاشرے کی مقنّنہ (قانون ساز مجلس) اور عدلیہ اس بات کی ہدایت نہیں دے سکتے کہ انصاف یہ ہونا چاہیے۔ ایسے کوئی بھی قاعدے، جن کے وہ خواب دیکھتے ہوں، ان قاعدوں کی نسبت بہتر کام نہیں کر سکتے جو ہماری فطرت کا حصہ ہیں۔ وہ جتنا کچھ کرنے کی امید کر سکتے ہیں، وہ بس اتنا ہے کہ وہ اس بات کو دریافت کریں کہ انصاف کے قاعدے کیا ہیں۔

انھیں کامن لا یا مقامی قانونی نظاموں کے عمل میں کام کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ افراد کے درمیان تنازعات، جیسے کہ ہمسائیوں کے درمیان حد بندی کے تنازعات، عدالتوں میں لائے جاتے ہیں۔ عدالت، مقدمے کے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، یہ دیکھ کر فیصلہ کرتی ہے کہ کیسا نتیجہ منصفانہ ہوگا۔ حد بندی کا کوئی دوسرا تنازعہ کئی اعتبار سے ایک جیسا ہو سکتا ہے، اور عدالت کو منصفانہ نتیجہ تلاش کرنے کی خاطر ایک اور کوشش کرنی پڑتی ہے۔ جج کسی وجہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتے۔ وہ نئے حالات پر ان اصولوں کا اطلاق کرتے ہیں، جنھیں طویل مدت سے قبول کیا جا رہا ہوتا ہے۔ اور آزمائش کے ایک طویل عمل کے ذریعے رفتہ رفتہ ایک مشترک افہام و تفہیم

سامنے آتی ہے کہ ہمسائیوں کے درمیان کس قسم کا طرزِ عمل منصفانہ سمجھا جاتا ہے، اور کس قسم کا غیر منصفانہ۔

انصاف، قانون، اخلاقیات یا برابری نہیں

ایک آزاد معاشرے میں انصاف کے قاعدوں کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا اطلاق ہر کسی پر یکساں ہونا چاہیے۔ ایک جیسے حالات میں موجود لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جانا چاہیے۔

قانون اور انصاف ہمیشہ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ مثلاً، قانون لوگوں کے ساتھ ہمیشہ ایک جیسا سلوک نہیں کرسکتا۔ اشرافیہ صاف طور پر انھیں اپنے دوستوں کی مدد اور دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے لیے تخلیق کرسکتی ہے۔ یہ غیر منصفانہ قوانین ہیں۔

اسی طرح، برابری، قانون جیسی چیز نہیں۔ یہ حقیقت کہ کچھ لوگ دولت مند ہیں اور دوسرے غریب ہیں، کسی معاشرے کو غیر منصفانہ نہیں بناتی۔ ایک نابرابری کا حامل معاشرہ، اتنا ہی منصفانہ ہوسکتا ہے، جتنا برابری کا حامل معاشرہ۔ شرط یہ ہے کہ لوگ اپنی ملکیت کو جائز اور بغیر کسی جبر کے حاصل کرتے ہوں، وہ پورے طور پر منصفانہ طور پر عمل کررہے ہوتے ہیں۔

نجی ملکیت کے کچھ نقاد یہ کہتے ہیں کہ ملکیت کا آغاز صرف چوری سے ہوسکتا ہے۔ یہ درست نہیں۔ وہ پہلے لوگ، جنھوں نے ویرانے میں پائے جانے والے، کسی کے استعمال اور ضرورت میں نہ ہونے والے، زمین کے کسی ٹکڑے پر دعویٰ کیا ہو، تو انھوں نے کسی دوسرے کو نقصان نہیں پہنچایا ہوتا۔ اگر وہ اس پر کھیتی باڑی اور اس میں سے دریافت ہونے والی قیمتی معدنیات سے فائدہ اٹھاتے ہوں، تو یہ ان کی خوش نصیبی ہے: یوں کسی دوسرے کے حالات میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی، لہٰذا، کوئی ناانصافی بھی نہیں ہوئی۔ اسی طرح، اگر کوئی کاروباری کوئی نئی شے یا نیا عمل ایجاد کرتا ہے، اور اسے رضامند خریداروں کو بیچ کر دولت مند بنتا ہے، تو کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا: اس کے برعکس، اس ایجاد سے پوری دنیا کو فائدہ ہوتا ہے۔

انصاف کا نفاذ

ایک آزاد معاشرے کا بنیادی مقصد طاقت کے استعمال کو کم سے کم کرنا ہے۔ لیکن انصاف کو بہر صورت نافذ کرنا ضروری ہے۔ اگر لوگ دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں، تو ہم توقع کرتے ہیں کہ انھیں جرمانہ یا قید کی سزا دی جائے گی۔ اس کا مطلب مجرم کے خلاف طاقت کا استعمال ہے۔ اگر انصاف کو قائم رکھنا ہے، تو کچھ نہ کچھ جبر ناگزیر ہے۔

ایک آزاد معاشرہ اس مخمصے کو یوں حل کرتا ہے کہ یہ جبر کی اجارہ داری سول حکام کو دیتا ہے۔ صرف وہ طاقت کو استعمال کر سکتے ہیں، اور وہ بھی صرف انصاف کے نفاذ اور داخلی اور خارجی دشمنوں سے شہریوں کی حفاظت کے لیے۔ دوسرے افراد کے ہاتھوں طاقت کا استعمال منع ہوتا ہے۔

اگر حکومت کو طاقت پر اجارہ داری رکھنی ہے، تو یہ سختی کے ساتھ محدود ہونی چاہیے۔ حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوتی ہیں، اور کسی بھی انسان پر یہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جبر کے اختیار کو غیر جذباتی انداز میں استعمال کرے گا۔ ذاتی مفاد کے لیے اس کے استعمال کا لالچ بہت زیادہ ہوتا ہے۔

اسی لیے، ایک آزاد معاشرے کا انصاف کا نظام ایسے کڑے قاعدے بناتا ہے، جو جبر کے استعمال سے متعلق حکام کے اختیار کو محدود رکھتے ہیں۔ مثلاً، حکام کے تفتیش اور گرفتاری کے اختیار پر سخت قاعدے لاگو کیے جاتے ہیں، اور اس بارے میں بھی کہ مقدمے کس طرح چلائے جاتے ہیں، اور سزائیں کس طرح دی جاتی ہیں۔ طریقِ کار سے متعلق قاعدے اس بات سے تعلق رکھتے ہیں کہ فیصلے کس طرح کیے جاتے ہیں، یہ نہیں کہ کیا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ عدالتی عمل کو درست اور منصفانہ سمجھنے کی خاطر ان قاعدوں کی پیروی لازمی ہوتی ہے۔

انصاف کو لاحق خطرات

اس فریم ورک کا مضبوط ہونا ضروری ہے، تاکہ حکام اپنے جبر کے اختیار کی مدد سے افراد کو غیر منصفانہ طور پر تنگ نہ کر سکیں۔ اس فریم ورک کو آسانی سے تباہ کیا جا سکتا ہے، یہاں تک

کہ وہ لوگ بھی ایسا کر سکتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ انصاف کے حق میں ایسا کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر، جج یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کام ایک درست نتیجہ سامنے لانا ہے، بجائے اس کے کہ وہ طریقِ کار سے متعلق قاعدوں پر عمل کریں۔ لیکن اس قسم کی عدالتی فعالیت (جوڈیشل ایکٹوازم) ججوں کی ذاتی رائے کو انصاف سے اوپر لے آتی ہے۔ یہ عدالتی کاروائی کو بھی ناقابلِ پیش بین بنا دیتی ہے: یعنی ایک ہی جرم کی مختلف سزائیں دی جاسکتی ہیں، جس کا انحصار مخصوص جج پر ہوتا ہے۔ اور یہ ان لوگوں کو جو طاقت میں ہوتے ہیں، عدالتی نتائج پر کہیں زیادہ اثر کا حامل بنا دیتا ہے: اگر وہ ججوں کو رشوت دے سکتے ہیں، یا انھیں دھمکا سکتے ہیں، تو وہ لوگوں کو ملنے والی سزا تبدیل کرا سکتے ہیں۔ لیکن اگر طریقِ کار سے متعلق ٹھوس قاعدے موجود ہیں، جن پر ہر حال میں عمل کرنا ضروری ہے، تو ایسے اثر ورسوخ کو گھٹایا جاسکتا ہے۔ یہ چیز ان سب کو جو عدالت میں آتے ہیں، اہم تحفظ مہیا کرتی ہے۔

ایک اور نقطۂ نظر جو انصاف کے انتظام کو نقصان پہنچاتا ہے، وہ 'سماجی انصاف' کا تصور ہے۔ دولت اور آمدنی کی زیادہ برابر تقسیم کی شعوری تخلیق، ملکیت اور انصاف کے اصولوں کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ مساوی تقسیم کو تخلیق کرنے کی خاطر، کچھ لوگوں سے ملکیت کو لینا اور دوسروں کو دینا پڑتا ہے۔ ملکیت کے قاعدوں کو، جو لوگوں کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ ملکیت رکھیں اور جیسے چاہیں اسے استعمال میں لائیں، ختم کرنا پڑتا ہے۔ پھر وہی بات کہ اگر ہم حکام کو لامحدود اختیار دیتے ہیں، تو کوئی محفوظ نہیں رہتا۔ کاروبار بھی تباہ ہو جائے گا: ملکیت کے حصول کے لیے کوئی کیوں خطرات مول لے اور کوشش کرے، اگر حکام اسے ضبط کر سکتے ہیں؟

تاہم، ایسے درست قاعدے، جن کا جائیداد کی ملکیت پر اطلاق کیا جاتا ہے، وہ ہمیشہ واضح نہیں ہوتے۔ کیا زمین کے ایک ٹکڑے کی میری ملکیت مجھے یہ حق دیتی ہے کہ اس کے نیچے جو معدنیات ہیں انھیں میں استعمال میں لاؤں؟ کیا یہ مجھے یہ اجازت دیتی ہے کہ میں لوگوں کو اس کے اوپر جہاز اڑانے سے منع کروں؟ کیا میں قریب موجود کسی کارخانے کو روک سکتا ہوں کہ وہ اپنی چمنی کے دھوئیں سے میری ہوا کو آلودہ نہ کرے؟ ان تفصیلات کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اور ایک آزاد

معاشرے میں، غیر جذباتی ججوں کے ہاتھوں عدالتوں میں ان کی مسلسل آزمائش ہوتی ہے اور انھیں بہتر بنایا جاتا ہے، اور یہ جج اس بات کو سامنے لاتے ہیں کہ اصل میں انصاف کے اصول کیا ہیں۔

فطری انصاف

ایک آزاد معاشرے میں، تمام قانون سازی اور قانون کا نفاذ، انصاف کے اصولوں کے تحت ہونا چاہیے، وہ اصول جو ہماری انسانیت میں اتنے گہرے پیوست ہیں کہ انھیں 'فطری انصاف' کہا جاتا ہے۔

پہلی بات یہ کہ قانون کو معلوم، واضح، اور یقینی ہونا چاہیے۔ اگر کوئی قانون خفیہ ہے یا یہ تبدیل ہوتا رہتا ہے، تو افراد یہ نہیں جان سکتے کہ کیا وہ اسے توڑ رہے ہیں، اور یوں خود کو قانونی چارہ جوئی سے بچا نہیں سکتے۔

قوانین کو قابل پیش بین ہونا چاہیے۔ افراد کو یہ جاننے کے قابل ہونا چاہیے کہ قوانین کا اطلاق کہاں ہوتا ہے اور کہاں نہیں ہوتا، اور انھیں توڑنے کے نتائج کیا ہوں گے۔ حتیٰ کہ جنھیں آزاد معاشرہ فرض کیا جاتا ہے، وہاں بھی اکثر کسی ایک مقصد کی خاطر قوانین متعارف کروائے جاتے ہیں، جیسا کہ دہشت گردی یا منظّم جرم کے خلاف، اور پھر انھیں بالکل مختلف مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ شہریوں کو جو اصل میں چھوٹے چھوٹے جرائم ہوتے ہیں، ان کے لیے سخت سزا بھگتنی پڑ سکتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ قوانین ماضی کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ ان کا اطلاق صرف ان اعمال پر ہوتا ہے، جو مستقبل میں ہو سکتے ہیں۔ دوسری صورت میں لوگوں کو ایسے اعمال کے لیے بھی قانونی چارہ جوئی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، جنھیں جب کیا گیا، اس وقت وہ مکمل طور پر قانونی تھے۔ پھر یہ کہ جن معاشروں کو آزاد فرض کیا جاتا ہے، وہ بھی اس میں ناکام ہوتے ہیں۔ مثلاً، 2008ء کا انگلینڈ کا ایک قانون، جس نے ٹیکس بچانے والی کچھ سکیموں کو غیر قانونی قرار دیا تھا، اور جس نے ایک گذشتہ قانون میں کچھ اس طرح ترمیم کی، جس نے 3000 لوگوں پر ٹیکس کی ادائیگی کی ذمے

داری عائد کر دی، جو اس وقت قانون کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔

انصاف کا تیسرا قاعدہ یہ ہے کہ قانون افراد کو ایسی کسی چیز کے کرنے کا پابند نہیں کر سکتا، جو نا قابلِ عمل ہو، کیونکہ یہ چیز بھی لوگوں کے لیے اس بات کو ناممکن بنا دے گی کہ وہ خود کو قانون کی خلاف ورزی سے بچا سکیں۔ یہاں تک کہ جن ملکوں کو آزاد فرض کیا جاتا ہے، وہ بھی اس آزمائش میں ناکام ہو جاتے ہیں: اس طرح، آگ سے متعلق قاعدے کسی عمارت کے مالک سے یہ تقاضا کر سکتے ہیں کہ وہ اس میں آگ کی صورت میں باہر نکلنے کا راستہ بنائیں، جبکہ منصوبہ بندی کے قوانین کے مطابق عمارت میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی، یوں مالک بہر صورت قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ غیر منصفانہ حکومتیں شعوری طور پر ایسے قوانین بناتی ہیں، جن پر عمل ممکن نہیں ہوتا، اور یوں اپنے مخالفوں کو نشانہ بناتی ہیں۔

فطری انصاف کا ایک اور بنیادی قاعدہ ہے معصوم تصور کرنا۔ کسی بھی شخص کے ساتھ مجرم جیسا سلوک نہیں کیا جا سکتا، جب تک اس پر جرم ثابت نہ ہو جائے، قطع نظر اس سے کہ اس کے خلاف مقدمے کو جھٹلایا نہ جا سکتا ہو۔ یہ بات اہم ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا دارومدار حکام پر ہے کہ وہ جرم کو ثابت کریں، نہ کہ وہ شخص اپنا معصوم ہونا ثابت کرے۔ یہ چیز حکومتوں کے لیے اس بات کو مشکل بنا دیتی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کو جھوٹے الزامات کی بنیاد پر ہراساں کریں: عدالت میں تمام الزامات کو ثابت کرنا پڑتا ہے اس سے پہلے کہ کسی کو سزا دی جا سکے۔

ایک آخری بنیادی اصول یہ ہے کہ ججوں اور عدالتوں کو سیاسی حکام سے آزاد ہونا چاہیے۔ ان لوگوں میں اختیارات کی علاحدگی ہونی چاہیے، جنھوں نے قانون بنانا ہے اور جنھوں نے اسے سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کرنا ہے۔ ججوں کو سیاست دانوں کا ایجنٹ نہیں ہونا چاہیے: ان کے سیاسی نظریات کیا ہیں، اس بات کا وہ مقدمات کس طرح نبٹاتے ہیں اس سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ اگر جج، سیاست دانوں سے اتنی قربت رکھتے ہیں، کہ وہ آسانی سے ان کے اثر میں آ سکتے ہیں، یا انھیں دھمکایا جا سکتا ہے، تو پھر عدالتی نظام، حقیقی انصاف کے بجائے، سیاسی مفادات

کی خدمت کرنے لگتا ہے۔ زیادہ آزاد معاشرے اکثر آزاد پینل بناتے ہیں، جو ججوں کا تقرر کرتے ہیں، یا عمر بھر کے لیے ان کی تقرری کرتے ہیں، جو اس امکان کو کم کرتا ہے کہ سیاست دان ان پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کر سکیں۔

قانون کی حکومت

قانون کی حکومت کا مطلب

قانون کی حکومت کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی نہیں ، جو غیر آزاد معاشرے کو آزاد معاشرے سے اتنے واضح انداز میں علاحدہ کرتی ہے۔ یہ یہی تصور ہے کہ شہریوں پر قانون کے واضح اور عمومی اصولوں کے مطابق حکومت کی جانی چاہیے، بجائے اس کے بادشاہوں اور سیاست دانوں کی بے بنیاد مرضی کے مطابق حکومت کی جائے۔ قانون ساز جیسے وہ چاہتے ہیں، ویسے نہیں کر سکتے۔ ان کے بنائے قوانین کا اطلاق، ان سمیت، ہر کسی پر یکساں ہونا چاہیے۔

قانون کی حکومت کا مقصد یہ ہے کہ اختیار کے بے بنیاد استعمال کے خلاف افراد کو تحفظ مہیا کیا جائے۔ اگر ہم حکومتوں کو طاقت پر اجارہ داری دیتے ہیں، تو ہمیں اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ یہ انھیں مقاصد کے لیے استعمال ہو رہی ہے، جن مقاصد کے لیے اسے استعمال ہونا چاہیے۔ اور یہ بات معلوم ہو کہ اس کے ساتھ جواب دہی جڑی ہوئی ہے، اور یہ کہ اسے پورے معاشرے کے عام فائدے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، صرف اشرافیہ کے فائدے کے لیے نہیں۔

قانون کی حکومت اس بات کو بھی یقینی بناتی ہے کہ جو ارباب ِاختیار ہیں، ان کو بھی غلط کاموں کے لیے وہی مجرمانہ سزائیں ملیں، جو ہر دوسرے فرد کو ملتی ہیں۔ ملکوں کی ایک پریشان کن تعداد اپنی حکومتوں اور سابق حکومتوں کے رہنماؤں کو قانونی چارہ جوئی سے مستثنیٰ قرار دیتی ہے، اور نتیجہ یہ ہے کہ ان رہنماؤں کی ایک پریشان کن تعداد کو انصاف سے فرار مل جاتا ہے۔ گو کہ جو عوامی رہنما ہوتے ہیں، ان کو، بلکہ دوسروں کو بھی، بے بنیاد اور پریشان کن قانونی چارہ جوئی سے تحفظ دینا

ہوتا ہے۔یعنی حقیقی انصاف سے کسی کو بھی استثنٰی نہیں ملنا چاہیے۔

قانون کی حکومت، حاکموں کے تبدیل ہوتے اور بے بنیاد فیصلوں کے بجائے، عمومی اور پائیدار اصولوں پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ قاعدوں کی مدد سے ہمارے لیے فطری انصاف کی ضمانت دیتی ہے، جیسے کہ قانون کی نظر میں برابری، قانون کے ضروری طریق کار پر عمل، آزاد عدلیہ، اندھا قانون، حبسِ بے جا (بغیر مقدمہ چلائے طویل عرصے تک قید رکھنا)، حکام کی طرف سے ہراساں نہ کیا جانا (جیسے کہ ایک ہی جرم کے لیے بار بار مقدمہ چلانا، جسے دہرا خطرہ (ڈبل جیپرڈی) کہا جاتا ہے)، معصوم تصور کرنا (یعنی آپ کو اس وقت تک مجرم نہ سمجھا جائے جب تک واقعتاً سزا نہ ہو جائے)، اور قوانین کا یقینی، مستحکم اور قابلِ عمل ہونا۔ اور یہ اہم ہے کہ جو لوگ قانون بناتے ہیں، دوسروں کی طرح وہ بھی اس کے پابند ہوں۔ ایک معاشرہ آزاد معاشرہ نہیں ہو سکتا، اگر وہاں کچھ لوگ، وہ کتنے ہی اعلیٰ مرتبے کے کیوں نہ ہوں، اپنے اعمال کے لیے جواب دہ نہیں۔

قانون کی حکومت کی حفاظت

ملکوں نے قانون کی حکومت کی حفاظت کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں تا کہ جو لوگ حکومت میں ہیں، وہ اسے نقصان نہ پہنچائیں۔ اس میں تحریری آئین، کامن لا اور نظیروں پر مبنی عدالتی طریق کار، اور فطری انصاف کے ساتھ بنیادی وابستگی شامل ہیں۔ لیکن جب کوئی ملک وجود میں آتا ہے، اس وقت آئین بنانا بہت آسان ہوتا ہے، جب شہری پہلی پہلی دفعہ اکٹھے ہو رہے ہوتے ہیں، بجائے اس کے کہ ایک پہلے سے وجود میں آئے ہوئے ملک میں آئین بنایا جائے، جہاں اشرافیہ اور پیوستہ مفادات طاقت پر قابض ہو چکے ہوتے ہیں، اور اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ وہ نئے آئین کو خود اپنے مفادات کے مطابق موڑ لیں۔

عدالتوں میں جو مختلف مقدمات لائے جاتے ہیں، ان کے نتیجے میں برسوں میں جو نظیریں (مثالیں) سامنے آتی ہیں، وہ بھی قانون کی حکومت کو مضبوط کرتی ہیں۔ افراد، قانون سازوں اور سرکاری حکام کے فیصلوں پر اعتراض کر سکتے ہیں، اور یہ کہ ان کا انصاف کتنا قانونی

ہے، اسے آزمانے کے لیے عدالت میں لے جا سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ، نظیروں کا ایک دفتر سرکاری اختیار کی حدود کی نشاندہی کر دیتا ہے۔

قانون کی حکومت کو مضبوط کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ انصاف کے قاعدوں اور ان اصولوں پر بحث ومباحثے کو فروغ دیا جائے، جو سماجی ہم آہنگی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اگر آزادیِ اظہار دستیاب ہوتی ہے اور ہر کوئی ان تصورات پر بحث کے لیے آزاد ہوتا ہے، تو حکام کے لیے ان کی سمجھ بوجھ کو خود اپنے مفاد میں توڑ نا مروڑ نا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

قانون کی حکومت پر جو بحثیں ہوتی ہیں، ان سے یہ بنیادی تصور سامنے آتا ہے کہ اگر لوگ پہلی دفعہ ان اصولوں کا فیصلہ کرنے کے لیے اکٹھے ہو رہے ہیں، جن کے مطابق ان پر حکومت کی جانی ہے، تو کوئی بھی اس بات پر متفق نہیں ہوگا کہ دوسرے اس پر جبر کریں، سوائے ان صورتوں کے، جن میں چوری یا تشدد کے سزائیں دی جائیں، کیونکہ وہ انھیں خود اپنے طویل مدتی فائدے کے حق میں سمجھیں گے۔ تو ہم معقول طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ تمام آزاد معاشروں کو عمومی اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے، جو جبر کو محدود کرتے ہیں اور مخصوص گروہوں کو اس قابل ہونے سے روکتے ہیں، کہ وہ دوسروں کا استحصال کریں۔

انصاف کا نظم ونسق

قانون کی حکومت کی حفاظت کے لیے جو بھی عمومی راستے ڈھونڈے جائیں، کچھ مخصوص اقدامات ایسے ہیں، جو یقیناً مددگار ہوتے ہیں۔

ججوں کو ذاتی حیثیت میں بھی اور سیاسی طور پر بھی آزاد ہونا چاہیے۔ دوسری صورت میں عدالتی نظام کو احترام نہیں دیا جائے گا، اور انصاف کے نام پر شدید قسم کی ناانصافی برتی جائے گی۔ بہت سے ملکوں میں، ججوں کو مناسب سے کم تنخواہ ملتی ہے، وہ جواب دہ نہیں ہوتے، اور ان پر نظر رکھنے کا نظام کمزور ہوتا ہے: لہٰذا، وہ مقدمات کا فیصلہ قانون کے بجائے، رشوتوں کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ جبکہ ججوں کو مناسب تنخواہ ملنی چاہیے، اور باقاعدگی کے ساتھ ان کی نگرانی ہونی چاہیے، تاکہ

ایسی کرپشن ضروری رہے، نہ اسے برداشت کیا جائے۔

انصاف کے نظام کو ایک اچھی عدالتی انتظامیہ کی مدد ملنا بھی ضروری ہے۔ بہت سے ملکوں میں، ایک چھوٹے سے تنازعے کو عدالتوں تک پہنچنے میں مہینوں یا حتیٰ کہ برسوں لگ جاتے ہیں، اس کی وجہ بیوروکریسی کا پھیلا ہوا وجود ہے، جو اس میں حائل ہوتی ہے، اور یہ بھی اہل کاروں کو مقدمات سے نبٹنے کی کوئی ترغیب بھی میسر نہیں ہوتی۔ ایک ایسا قانونی نظام جو نظیر کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے، اسے تیزی کے ساتھ مقدمات اور فیصلوں تک پہنچ درکار ہوتی ہے، اس لیے کہ مقدمات فضول طور پر عدالت میں نہ لائے جائیں، کیونکہ ماضی کی نظیروں کا ریکارڈ دستیاب نہیں ہوتا۔

بہت سے ملکوں میں، پولیس بھی مسئلہ ہے، بجائے اس کے کہ یہ مسئلے کا حل ہو۔ ان کے پاس جو گرفتار اور قید کرنے کا اختیار ہوتا ہے، اس کی وجہ سے، وہ لوگوں کو شدید قسم کی ناانصافی کا شکار بنا سکتے ہیں اور کرپشن کے ذریعے خود کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ افسروں کا حقیقی یا خیالی، چھوٹی چھوٹی ٹریفک کی خلاف ورزیوں پر معمولی 'جرمانہ' عائد کرنا اس کی مثال ہے۔ یہ مروج ثقافت کا معمول بن جاتا ہے، لیکن جب لوگ رشوت کے اصول کو قبول کر لیتے ہیں، تو بدترین چیزوں کو بھی روکنے کا کوئی قاعدہ باقی نہیں رہ جاتا۔ پولیس کی مناسب تربیت درکار ہوتی ہے اور ان کی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے، اور آئیڈیل تو یہ ہے کہ یہ کام ایک آزاد ایجنسی کرے، جس کے پاس پولیس کے خلاف شکایت کی تفتیش اور ان پر عمل کرنے کا اختیار ہو۔

اسی طرح، بیوروکریسی کی تقرری قابلیت پر ہونی چاہیے، بجائے اس کے کہ ان کا تقرر سیاسی پسندیدگی کی بنا پر ہو۔ ان کی مناسب جواب دہی ہونی چاہیے۔ سیاسی یا ذاتی فائدے کے لیے جو فیصلے کیے جائیں، ان پر سزا ملنی چاہیے۔

انتخابات منصفانہ ہونے چاہییں، اگر انصاف اور قانون کی حکومت کو باقی رہنا ہے۔ آزادیٔ اظہار ہونی چاہیے، تاکہ وہ امیدوار جو حکام پر تنقید کرتے ہیں، وہ انتخابات میں کھڑے ہو سکتے ہوں، اور اپنے نقطۂ نظر کو سب کے سامنے رکھ سکتے ہوں۔ خفیہ بیلٹ ہونا چاہیے اور ایک حقیقی

طور پر آزاد الیکشن کمیشن، جو اس بات کو یقینی بنائے کہ انتخابی حد بندی منصفانہ طور پر کی جائے اور انتخابات دیانت داری کے ساتھ منعقد ہوں۔

انصاف اور معاشی ترقی

قانون کی حکومت، معاشی طور پر بھی اور سماجی طور پر بھی اہم ہے۔ ورلڈ بینک ہر برس کاروبار میں آسانی کی بنیاد پر ملکوں کی درجہ بندی کرتا ہے۔ دنیا بھر سے کاروبار اور سرمایہ کاری کو لانے کی خاطر، اور ملک کے اندر لوگوں کو آسانی کے ساتھ تجارت کرنے دینا، معاشی ترقی اور آبادیوں کی خوشحالی کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ اشاریہ ٹیکسوں اور ضابطوں کی شفافیت، سرکاری اہل کاروں میں کرپشن کی سطح، لوگ کتنی آسانی سے کاروبار شروع کر سکتے ہیں، ملکیت رجسٹر کروا سکتے ہیں، سرحد پار تجارت کر سکتے ہیں، دیوالیے سے کیسے نبٹتے ہیں، اور ایسے ہی دوسرے معاملات کو دیکھتا ہے۔

سنگاپور، جو معاشی طور پر بہت آزاد ہے (گو کہ سماجی طور پر کہیں کم آزاد ہے)، سات برسوں سے اونچے درجے پر قائم ہے، دوسرے نسبتاً آزاد ملک، جیسے کہ ہانگ کانگ، نیوزی لینڈ، ڈینمارک، یو کے، اور ریاست ہائے متحدہ فہرست میں اس سے پیچھے ہیں۔ اس کے بعد جمہوریہ (جنوبی) کوریا کا ملک آتا ہے، جو ایک اور ایسا ملک ہے، جو معاشی طور پر آزاد ہے، مگر سماجی طور پر ایک پابند ملک ہے۔ درجہ بندیوں کے نیچے وہ ملک ہیں، جیسے کہ کانگو، وینیز ویلا، زمبابوے، عراق، کیمیرون، بولیویا اور ازبکستان، جہاں انصاف اور قانون کی حکومت، بدنامی کی حد تک کمزور ہے۔

قانون کی حکومت کو لاحق خطرات

بہت سے ملکوں میں، خاص طور پر ترقی پذیر ملکوں میں، انصاف کے مختلف نظام موجود ہیں۔ ریاستی سطح کے قوانین اور انصاف کے نظاموں کے علاوہ، وہاں، مقامی، قبائلی یا مذہبی قانونی نظام موجود ہوتے ہیں، اور نجی یا افراد کے درمیان معاہداتی قانون بھی موجود ہوتا ہے۔

ریاستی نظام میں کرپشن کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ مقامی، مذہبی اور نجی قانونی نظاموں

کی جڑیں عام طور پر فطری انصاف میں بہت گہری ہوتی ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ انھیں زیادہ قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، ریاستی نظاموں کو اکثر نوآبادیاتی یا قابض طاقتوں نے مسلط کیا ہوتا ہے۔ انھیں کبھی زیادہ قبولِ عام حاصل نہیں ہو پاتا، لیکن ان کی طاقت اور سرپرستی کسی بھی کرپٹ شخص کو فائدہ اٹھانے کے قابل بناتی ہے۔

حکومت اور ریاستی عدالتوں میں موجود لوگ اکثر ریاستی اختیار سے فائدہ اٹھانے کو کچھ غلط نہیں سمجھتے۔ فوج، پولیس، اور سرکاری اہل کار رشوت لیتے ہیں۔ سیاست دانوں سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنی مقامی آبادی، یا خود کو بھی فائدہ پہنچانے کے لیے ریاست کو لوٹیں گے۔ لیکن جس چیز کو نجی زندگی میں غلط سمجھا جاتا ہے، اسے عوامی دائرے میں بھی غلط سمجھا جانا چاہیے۔

ان جگہوں پر جہاں سفر اور رابطے مشکل ہیں اور مقامی مسائل فوری توجہ چاہتے ہیں، وہاں نظاموں کے ایک ملغوبے سے کام لینا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن انصاف کے تمام نظاموں کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ مقامی قوانین کے اختیار اور قبولیت کو، ریاستی قوانین کے اصول اور وضاحت کو، اور قانون کی حکومت کی معروضیت کو تسلیم کریں۔

انسانی حقوق

انسانی حقوق کی تعریف

انصاف پر مذکورۂ بالا غور و فکر سے انسانی حقوق کا تصور سامنے آتا ہے۔ یہ تصور یہ ہے کہ ان کی انسانیت کے ناطے انھیں کچھ بنیادی آزادیاں ملتی ہیں، یعنی حقوق، جو فطری قانون کی طرح، معاشرے کے ہموار چلن کو فروغ دیتے ہیں، لیکن حقوق کو صاف طور پر آفاقی (جن کا اطلاق ہر جگہ اور ہر کسی پر ہوتا ہے) اور ناقابلِ انتقال (انھیں ترک نہیں کیا جا سکتا، نہ دوسرے انھیں مسترد کر سکتے ہیں) کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔

ان انسانی 'حقوق' کو انسانی آزادیاں کہنا زیادہ بہتر ہو سکتا ہے۔ ان میں ملکیت رکھنے،

حقِ خود اختیاری، اور خود اپنے جسم اور محنت کی ملکیت، حرکت کی آزادی، اور جہاں آپ چاہیں وہاں بسنے کی آزادی۔ ان کا اثر ریاست کو محدود کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک کر سکتی ہے۔

بدقسمتی سے، 'انسانی حقوق' کو عام طور پر قانونی حقوق کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے، جنھیں سیاسی ڈھانچے کی مدد سے مہیا کیا جاتا ہے، یا پھر سماجی اور ثقافتی اصولوں کے ذریعے۔ لیکن مثال کے طور پر، وہ قوانین، جو کارکنوں کو تنخواہ سمیت چھٹیاں دیتے ہیں، انسانی حقوق نہیں، کیونکہ وہ آفاقی نہیں۔ ان کا اطلاق کارکنوں پر ہوتا ہے، اور صرف ان ملکوں میں، جہاں اس تعیش کی گنجائش ہوتی ہے۔ اور یہ انھیں بیگانہ بنا سکتے ہیں، ایک کارکن کو چھٹی کے بدلے پیسہ لینے کا حق دیا جاتا ہے، اور اس کی کوئی آزادی بھی ختم نہیں ہوتی۔ اسی طرح، مردوں اور عورتوں کی برابر تنخواہ سے متعلق قوانین، انسانی حقوق نہیں، کیونکہ وہ انسانی آزادی کا دعویٰ نہیں ہوتے، بلکہ آجروں پر ایک جابرانہ تقاضا ہوتے ہیں۔

گروہوں کے حقوق بھی انسانی حقوق نہیں ہوتے۔ ان کا اطلاق آفاقی طور پر نہیں ہوتا۔ جیسے کہ امریکہ کے مقامی لوگوں کے ساتھ خصوصی سلوک، صرف قانونی مراعت ہے: دوسرے لوگ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ کوئی چیز 'انسانی' حق نہیں ہو سکتی، اگر یہ لوگوں کی انسانیت پر مرکوز نہیں ہوتی، بلکہ ان کے کسی خصوصی گروہ کا رکن ہونے پر توجہ دیتی ہے۔

آزادیاں، حقوق اور فرائض

ان معاملات کے بارے میں صاف ذہن ہونا اہم ہے۔ انسانی حقوق کو سماجی اصولوں اور قانونی مراعات کے ساتھ خلط ملط کرنے سے قانونی مراعات کو ایک غلط سند مل جاتی ہے اور انسانی حقوق کا پورا تصور ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔ جبکہ کچھ چیزیں، جیسے کہ برابر تنخواہ، تنخواہ سمیت چھٹیاں، یا کسی پچھڑے ہوئے گروہ کی خصوصی قبولیت، پسندیدہ ہو سکتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز جو پسندیدہ ہو، انسانی حق نہیں ہوتی۔

انسانی 'حقوق' ہماری آزادی کی ضمانت دیتے ہیں، وہ کسی اور پر جابرانہ تقاضا مسلط نہیں کرتے۔ مثلاً، تقریر کی آزادی، کس پر کوئی ذمے داری یا فریضہ عائد نہیں کرتی، سوائے اس ذمے داری یا فریضے کے کہ اس کا احترام کیا جائے۔ کسی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ آپ کو کسی اخبار کا کالم یا ریڈیو شو مہیا کرے تا کہ آپ اپنے خیالات کو نشر کر سکیں، نہ ہی وہ آپ کی مدد کرنے کا پابند ہے کہ آپ واقعتاً آزادی سے اظہارِ رائے کر سکیں، نہ ہی اسے سننے کا پابند ہے، جو کچھ آپ کہہ سکتے ہیں۔

اس کے برعکس، اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے اعلامیے میں، مفت تعلیم، انسانی حقوق کی فہرست میں ہے۔ مگر مفت تعلیم، کوئی انسانی حق نہیں، کیونکہ اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ دوسرے لوگ اس بات کے ذمے دار ہیں کہ وہ اس کے لیے ادائیگی کریں۔ تعلیم کی فراہمی پر لاگت آتی ہے، وقت، کوشش، مواد اور پیسہ، اسے مہیا کرنے پر صرف ہوتے ہیں۔ ایک سچے آزاد معاشرے میں، کوئی مفت تعلیم کے حق کا حامل نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ چیز دوسرے لوگوں پر یہ ذمے داری عائد کرے گی کہ وہ اس کے لیے وسائل مہیا کریں۔ (یقیناً بہت سے لوگ پوری رضامندی کے ساتھ اس لاگت میں حصہ ڈالنا چاہیں گے: لیکن ایک آزاد معاشرہ انھیں ایسا کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا۔)

لوگ اکثر حقوق کی بات کرتے ہیں، مگر وہ کبھی اس چیز کی طرف اشارہ نہیں کرتے، یا اسے تسلیم ہی نہیں کرتے، کہ یہ دوسرے لوگوں پر کیا ذمے داریاں عائد کرتے ہیں، یعنی وہ جبر جس پر عملدرآمد کے لیے ان کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس وسیع تر نقصان کی بھی، جو اس جبر سے جنم لیتا ہے۔

ایک مرتبہ پھر، آزاد معاشروں میں ویلفیئر کا کوئی حق موجود نہیں ہوتا: جس کا مطلب یہ ہوگا کہ کچھ کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کریں، جبکہ ان کی ذمے داری صرف یہ ہے کہ وہ کسی کو نقصان نہ پہنچائیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ویلفیئر کی ثقافت کی نسبت یہاں غریبوں یا

معذور لوگوں کی دیکھ بھال نہیں ہوتی۔ ویلفیئر پر جو لاگت آتی ہے، وہ کام اور کاروبار کی حوصلہ شکنی کرتی ہے، اور یوں پورے معاشرے کو غریب تر بناتی ہے، اور ویلفیئر سے ملنے والے فائدے محتاجی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اور حکومت کی بیوروکریٹک ایجنسیوں کے بجائے، ایک دولت مند، آزاد معاشرے کی فلاحی تنظیمیں ضرورت مند لوگوں کی بہتر مدد کر سکتی ہیں۔

ساتواں باب
خودرو معاشرہ

نظام جس میں کوئی حکم نہیں چلاتا

ایک آزاد معاشرے کو خود چلنے کے لیے ایک بہت بڑی ریاست کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ حیران کن معلوم ہوسکتا ہے، لیکن انسانی زندگی میں ایسی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ جیسا کہ امریکی معیشت دان ڈینیئل بی کلائین کا کہنا ہے، ایک رولر سکیٹنگ تختہ، جس پر شیر خوار بچوں سے لے کر معمر لوگ تک، شاید ایک سو یا زیادہ لوگ، سوار ہوتے ہیں، جن کے جوتوں کے ساتھ پہیے جڑے ہوتے ہیں، لیکن انھوں نے کوئی ہیلمیٹ، یا گھٹنے کا حفاظتی پیڈ یا سکیٹنگ کا سامان نہیں پہنا ہوتا، اور سب مختلف رفتار سے ایک سخت فرش پر چکر میں گھوم رہے ہوتے ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ بس ان کے ایکسیڈینٹ ہونے کا ایک سلسلہ شروع ہونے ہی والا ہے۔ لیکن اصل میں سکیٹر تختے پر اپنا اپنا راستہ بناتے ہیں اور چکر لگاتے ہیں، دوسروں سے بچتے ہوئے، اور اس میں رفتار سے متعلق کسی باضابطہ حد، اشاروں کے بدلنے، اور رکنے کے لیے روشنیوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کسی منصوبہ بندی کرنے والے یا کسی پولیس ایجنیسی کی ضرورت نہیں ہوتی، جو انھیں بتائے کہ کہاں اور کتنی رفتار سے سکیٹ کریں۔ ہر کوئی خود اپنا خیال رکھتا ہے، اور مشترک طور پر کچھ نہ کچھ دوسروں کا بھی، وہ مزا لینے کے اپنے باہمی مفاد کو حاصل کرتے ہیں، جبکہ ٹکراؤ سے بچتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ متاثر کن بات یہ ہے کہ انسانی زبان کی ساخت بہت اعلیٰ درجے کی ہے اور ہمارے لیے بہت فائدہ مند ہے، گو کہ اسے کسی طاقت نے شعوری طور پر ڈیزائن نہیں کیا۔

گرامر کے قاعدے، جو زبان کو کام کرنے کے قابل بناتے ہیں، بالکل فطری طور پر، صدیوں میں بنے ہیں، کیونکہ وہ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہم ان قاعدوں پر عمل کرتے ہیں، گو کہ وہ بہت نازک اور پیچیدہ ہیں، اور انھیں لکھنے میں ہمیں مشکل پیش آئے گی۔ کوئی حکومتی کمیشن کبھی ایسے قاعدے نہیں بنا سکتا تھا، جو اس قدر پیچیدہ، نازک اور موثر ہیں۔ یہ بس ہمارے ساتھ بڑے ہوئے ہیں۔

انسانی معاشرے کے بہت سے شعبے اسی طرح کام کرتے ہیں۔ کسی سرکاری اہل کار کے بتائے بغیر کہ ہمارا طرزِ عمل کیسا ہونا چاہیے، ہم ترتیب سے، باقاعدگی کے ساتھ، ایسے انداز میں جن کی پیش بینی ممکن ہوتی ہے، بس چند بنیادی قاعدوں پر عمل کرتے ہیں، جو ہماری فطرت کے حصے کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہم ان کے ساتھ ہی بڑے ہوئے ہیں۔ ان پر عمل کرتے ہوئے، ہم وسیع اور بے حد فائدہ دینے والے سماجی نظام تخلیق کرتے ہیں۔ مثلاً، وہ سادہ سے قاعدے، جو ہمیں پُرامن طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ تجارت کے قابل بناتے ہیں، انھوں نے منڈی کی بین الاقوامی معیشت کو تخلیق کیا ہے، جس کی مدد سے پوری دنیا تعاون کرتی ہے۔

معاشرے، قاعدے جن کی رہنمائی کرتے ہیں

ایک آزاد معاشرے کے بین الاشخاصی قاعدے، ایک ایسے معاشرے کی نسبت، لوگوں کو بہت گنجائش دیتے ہیں، جو حکومت کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔ آزاد افراد بہت سی ایسی چیزیں کر سکتے ہیں، جنھیں خاص طور پر ممنوع قرار نہیں دیا گیا ہوتا، بجائے ان چند چیزوں کی حد تک محدود ہونے کے، حکام جنھیں کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آزاد معاشرے کہیں زیادہ لچک دار اور حالات کے مطابق تبدیل ہونے والے ہوتے ہیں، یہ بدلتے ہوئے حالات سے آسانی سے ہم آہنگ ہوتے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ احکامات کا انتظار کریں۔

ان قاعدوں میں، جیسے کہ ایک منڈی کی معیشت میں ملکیت اور جائیداد سے متعلق قاعدے، ایک قسم کی دانائی موجود ہوتی ہے، جو برسوں میں دریافت ہوتی ہے، اور جس کا تعلق اس

بات سے ہوتا ہے کہ کیا چیز کام دیتی ہے اور کیا چیز کام نہیں دیتی۔ یہ بدلتے حالات کے مطابق بدلتے ہیں، اور ان میں آزمائش اور غلطی سے حاصل کیے گئے سبق کا عکس موجود ہوتا ہے، جو بہت سے برسوں اور لاکھوں انسانی معاملات کے نتیجے میں سیکھا گیا ہوتا ہے۔ ان میں طرزِ عمل سے متعلق اصول، یعنی یہ کہ دوسروں کے ساتھ کیسے پیش آیا جائے، قانونی اصول، جو تحریر میں فطری قانون کے اظہار کی کوشش کرتے ہیں، اور کامن لا، جسے لاتعداد آزمائشی مقدموں پر تعمیر کیا گیا ہوتا ہے، شامل ہوتے ہیں۔

ایک خود رو معاشرہ، جس کی رہنمائی قاعدے کرتے ہیں، نہ صرف زیادہ تخلیقی اور بدلنے والا ہوتا ہے، بلکہ یہ ایک ایسے معاشرے کی نسبت، جسے کسی مرکز سے چلایا جاتا ہے، کہیں زیادہ پیچیدہ بھی ہوسکتا ہے۔ زبان کی طرح، یہ اتنا پیچیدہ ہوسکتا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کے تمام قاعدوں کو بیان نہیں کرسکتا، اور پھر بھی یہ بہت اچھی طرح کام کرتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ، جو کسی طاقت کے احکامات پر مبنی ہوتا ہے، ناگزیر طور پر سائز اور فطرت دونوں میں ان چند لوگوں کی ذہنی دوڑ تک محدود ہوتا ہے، جو طاقت میں ہوتے ہیں۔ لیکن قاعدوں پر قائم معاشرہ، جو لاکھوں لوگوں کے میل جول سے ہزاروں برسوں میں تعمیر کیا گیا ہوتا ہے، بہت وسیع تر اور گہری دانائی کا حامل ہوتا ہے۔ جس معاشرے کو مرکزی انداز میں چلایا جاتا ہے، وہ چند لوگوں کی دانائی پر مبنی ہوتا ہے، جبکہ قاعدوں کی رہنمائی میں چلنے والا معاشرہ لاتعداد لوگوں کی دانائی کو سمیٹے ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حکومت کے بااختیار لوگ اکثر اس غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک معاشرے، یا معیشت کا منصوبہ بہتر اور زیادہ عقلی انداز میں بنا سکتے ہیں، بجائے اس کے کہ انھیں سماجی اور معاشی میل جول کے روزمرہ قاعدوں کی مدد سے چلنے دیا جائے۔ قاعدوں کے اس پیچیدہ نظام میں موجود دانائی کو چھوڑ کر یا توڑ مروڑ کر وہ لوگ چیزوں کو ہمیشہ مزید خرابی کی طرف لے جاتے ہیں۔

بکھرا ہوا علم اور طاقت

خود رو اور قاعدوں کی رہنمائی میں چلنے والے معاشروں کی داخلی دانائی کسی مرکز میں

موجود نہیں ہوتی۔ یہ ان لاکھوں افراد کے پاس ہوتی ہے، جو اپنی روزمرہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ چونکہ طاقت بکھری ہوئی ہوتی ہے، یہ افراد زندگی سے متعلق خود اپنے چھوٹے چھوٹے تجربات کر سکتے ہیں۔ وہ ایسے خطرات اور مواقع سے کھیل سکتے ہیں، جن سے، خود اپنے بجائے، کسی دوسرے کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ان خطرات سے فائدہ ہوتا ہے، تو ہر کوئی انھیں اختیار کر سکتا ہے اور ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ چیز بدلتے حالات کے ساتھ تجربہ کاری اور تبدیلی کو فروغ دیتی ہے، جو تبدیلی کی دنیا میں خودرو معاشرے کو کامیابی کا زیادہ موقع دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں، حکومت کے بااختیار لوگ ہر کسی کے لیے فیصلے کرتے ہیں، اور یوں ہر کسی زندگی اور قسمت کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔ لہٰذا، انھیں آزاد افراد کی نسبت زیادہ احتیاط پسندی کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے، یا پھر وہ بہت بڑی غلطیاں کرنے کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر آزاد معاشرے کم رفتار اور کم کامیابی سے بدلتے ہیں۔

یقیناً، خودرو معاشرے اور معیشت کبھی غلطی سے پاک نہیں ہو سکتے۔ وہ انسانی عمل (گو کہ انسانی ڈیزائن کا نہیں) پھل ہوتے ہیں اور انسان کبھی غلطی سے پاک نہیں ہو سکتے۔ مثلاً، ہم مستقبل کی پیش بینی نہیں کر سکتے، لہٰذا، ہم اس کے مطابق بدلنے کی اپنی کوششوں میں غلطیاں کر سکتے ہیں۔ اور ہم سب کے پاس جو معلومات ہوتی ہیں، وہ ناگزیر طور پر جزوی اور مقامی ہوتی ہیں۔ لیکن انسانی میل جول کی آزاد دنیا میں، یہ جزوی اور مقامی معلومات، ایک نہایت ذہین اور بدلنے والے معاشرے اور معیشت کو چلاتی ہیں۔

ایک آزاد معاشرے میں، لوگ اس بات کو خود سمجھتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہم آہنگی کیسے اختیار کریں، جو اسی طرح دوسرے لوگوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی کوشش میں ہوتے ہیں۔ یہ بھیڑ کے وقت ریلوے سٹیشن کی طرح ہوتا ہے، جب ہر کوئی باہر نکلنے کے بہت سے راستوں میں سے اپنا راستہ بنانے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے، یا اندر آنے کے کئی راستوں میں کسی ایک راستے سے آ کر اپنی مخصوص ٹرین تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ ہر کسی کی نظر میں یہ بات

ہوتی ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے، گو کہ وہاں ان کا راستہ غالباً بالکل سیدھا نہیں ہوتا۔ انھیں بہت سے لوگوں میں سے گھوم گھام کر گزرنا ہوتا ہے، جن میں سے ہر ایک یہی کچھ کر رہا ہوتا ہے، اپنی سمت بدلتے ہوئے، جیسے جیسے کوئی ان کے راستے میں آتا ہے۔ یہ ایک انتشار جیسا معلوم ہو سکتا ہے، لیکن دراصل ہر کوئی بغیر کسی جھگڑے کے اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ اگر کسی طاقت کو سینکڑوں یا ہزاروں لوگوں کو یہ بتانا ہو کہ وہ سٹیشن پر کس وقت اور کہاں حرکت کریں، تو ہر کسی کو گھنٹے یا دن لگ سکتے ہیں، وہاں پہنچنے میں، جہاں وہ جانا چاہتا ہے۔ یہ مسئلہ اتنا زیادہ پیچیدہ ہے کہ اسے مرکزی طور پر حل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن خودرو معاشرہ اس مسئلے کو آسانی کے ساتھ اور حقیقی وقت میں حل کرتا ہے۔

برداشت اور رواداری

برداشت کا مفہوم

ایک آزاد معاشرے میں، ہر کسی کو اس انداز میں دوسروں کے اعمال کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ہوتا ہے۔ سو یہ اہم ہے کہ لوگ دوسروں کے بارے میں برداشت اور رواداری کا مظاہرہ کریں، ان سمیت جن کے اعمال اور طرزِ زندگی سے وہ اختلاف رکھتے ہوں یا اسے عجیب وغریب سمجھتے ہوں۔

ایک آزاد معاشرے میں ہم کسی کو کسی چیز سے روک نہیں سکتے، صرف اس بنا پر کہ ہم اس چیز کو ناپسند کرتے ہیں۔ ہم صرف اس صورت میں مداخلت کر سکتے ہیں، اگر ان کے اعمال دوسروں کو نقصان پہنچا رہے ہوں، یا انھیں نقصان پہنچانے کا امکان رکھتے ہوں۔ جان سٹوارٹ مل کا 'جسمانی نقصان' سے صاف طور پر یہی مطلب مراد تھا۔ اگر 'نقصان' میں ایسی چیزوں کو شامل کر دیا جائے، جیسے کہ صدمہ، اخلاقی اشتعال یا پشیمانی، تو پھر کسی بھی قسم کے عمل کو ممنوع قرار دیا جا سکتا ہے، اور یوں آزادی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ بہرصورت، ان لوگوں کے اخلاقی اشتعال کو، جو ایک طرزِ عمل کو ممنوع قرار دینا چاہتے ہیں، ان لوگوں کے اخلاقی اشتعال سے مشابہ قرار دیا جائے گا،

جنھوں نے اس پر عمل کرنے کی اپنی آزادی کی روک پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ قطع نظر اس سے کہ ہر فریق کتنی تعداد میں ہے، یا کتنا جذباتی ہے، ان کے درمیان فیصلہ کرنے کا کوئی غیر جانبدارانہ طریقہ دستیاب نہیں۔ اور چونکہ ایک آزاد معاشرہ تنازعات کو طاقت کے ذریعے طے کرنے کی اجازت نہیں دیتا، ہر فریق کو دوسروں کی رائے، طرزِ عمل اور طرزِ حیات کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔

یہ اخلاقی لاتعلقی جیسی بات نہیں۔ وہ والدین جو بچے کے برے طرزِ عمل کی حوصلہ شکنی نہیں کریں گے، تو اسے برداشت نہیں کہا جائے گا، بلکہ وہ بچے کی اخلاقی تعلیم سے لاپروائی برتیں گے۔ اگر بڑے لوگوں کا طرزِ عمل ایسا ہوگا، جسے اہم چونکا دینے والا سمجھیں گے، ہمیں پورا حق ہے کہ ہم انھیں ایسا کہیں اور انھیں مختلف طرح عمل کرنے کے لیے مائل کریں، گو کہ طاقت کے ذریعے نہیں۔

نہ ہی برداشت اور رواداری، اخلاقی اضافیت جیسی کوئی چیز ہے، یعنی یہ تصور کہ تمام اخلاقیات مساوی طور پر درست ہے، کیونکہ لوگ اخلاقیات کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں، ان کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے کوئی غیر جانبدارانہ طریقہ دستیاب نہیں۔ ہمیں یہ سمجھنے کا پورا حق ہے کہ خود ہمارا اخلاقی یا مذہبی ضابطہ دوسرے لوگوں کی نسبت بہتر ہے، مگر ہمیں اپنے خیالات دوسروں پر ٹھونسنے کا کوئی حق نہیں۔

برداشت، مختلف ہونا اور انتخاب

جب آبادیاں بہت زیادہ مختلف قسم کی ہوں، تو برداشت بہت مشکل ہو سکتی ہے۔ بین الاقوامی سفر میں آسانی، ہجرت سے متعلق پابندیوں میں کمی، اور زیادہ عالمگیر معیشت، یہ چند وجوہات ہیں، جنھوں نے بہت سے ملکوں کی آبادیوں کو بہت رنگا رنگ بنا دیا ہے، جبکہ چند دہائیاں پہلے ایسا نہیں تھا۔

کچھ لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ زیادہ انتخاب کا نتیجہ مختلف نسلی، ثقافتی، قومی، لسانی یا مذہبی گروہوں کی زیادہ علاحدگی کی صورت میں نکلے گا، اور یوں تنازعات بڑھیں گے، جو برداشت

کو نقصان پہنچائیں گے۔ مثلاً، والدین اپنے بچوں کو اپنی نسل کے دوسرے لوگوں کے ساتھ تربیت کرنا چاہیں گے، اور اگر وہ خود اپنے سکولوں کا انتخاب کر سکتے ہوں گے، تو علاحدگی کے مواقع زیادہ ہو سکتے ہیں، بجائے اس کے کہ بچے صرف اس سکول میں جائیں، جسے حکومت کے بااختیار لوگوں نے ان کے لیے مخصوص کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سکولوں کے ہم آہنگ ہونے کا امکان اس وقت کم ہو جاتا ہے، جب حکومت سکولوں کی جگہ کا فیصلہ کرتی ہے، کیونکہ بچوں کو عام طور پر قریب ترین سکول میں بھیجا جائے گا۔ اور چونکہ ایک نسل کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں، سکول کی آبادی مخلوط بچوں کی عکاسی نہیں کرے گی۔ لیکن اگر والدین سکولوں کا انتخاب کریں گے، تو وہ دوسری جگہوں کے سکولوں کے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں، یا ایسے سکولوں کے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں، جن میں کوئی ایسی خصوصیت پائی جاتی ہو، جیسے کہ نسل، جسے وہ زیادہ قابلِ قدر سمجھتے ہوں، جیسے کہ تدریسی، موسیقی یا لسانی قابلیت۔

نسلی علاحدگی، بالکل فطری ہے، اور لوگ اپنے دوستوں اور شریکِ کار کا انتخاب ایک جیسے گروہ سے کرتے ہیں۔ لیکن اس میں اور دوسری آبادیوں کے بارے میں برداشت نہ رکھنے میں بہت فرق ہے۔ بدترین نسلی تنازعے ان جگہوں پر ہیں، جہاں گروہوں کو حقوق نہیں دیے جاتے اور دوسروں کو جو فائدے حاصل ہوتے ہیں، وہ انھیں نہیں دیے جاتے۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ جب ایک آزاد معاشرے کے اصولوں کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔

سیاسی درستگی

برداشت کو ایک اور زیادہ نازک خطرہ بھی لاحق ہے: یہ ہے سیاسی درستگی۔ اس میں افراد پر یہ سماجی اور سیاسی دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ وہ کسی مروج اشرافیہ کے رویوں اور رائیوں کو قبول کریں۔ عام طور پر جو لوگ مروج رائیوں سے اتفاق نہیں کرتے، پاگل یا چالاک کی حیثیت سے ان کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے، اس کا مقصد ان کی رائیوں کو پاگل یا چالاک بتانا ہوتا ہے۔ یہ چیز اس بات کی

اجازت دیتی ہے کہ ان رائیوں پر بحث کی جائے، مگر انھیں آسانی سے مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی مراد ہوتی ہے کہ اشرافیہ کے نظریات زیادہ ٹھوس ہیں، جبکہ حقیقت میں وہ ایسے نہیں ہوتے۔

اس عمل کا دارومدار جبر کی ایک نازک قسم پر ہوتا ہے، جس میں وہ لوگ، جن کی رائے مختلف ہوتی ہے، انھیں داغدار بنا دیا جاتا ہے، تاکہ ان کے لیے معاشرے میں اپنا راستہ بنانا مشکل ہو جائے۔ مثال کے طور پر، وہ اساتذہ، جو ماحولیاتی تبدیلی کے حق میں دی جانے والی شہادت پر سوال اٹھاتے ہیں، انھیں یونیورسیٹی کی نوکری سے نکالا جا سکتا ہے یا انھیں ترقی نہیں دی جاتی۔ ایک آزاد معاشرے میں، آجر یقیناً اس بات کے پابند نہیں ہوتے کہ وہ ایسے لوگوں کو روزگار نہ دیں، جو اختلاف کرتے ہیں؛ نہ ہی میڈیا پر یہ ذمے داری ڈالی جاتی ہے کہ وہ متنازعہ نظریات کی خبر نہ دے۔ لیکن جہاں تعلیمی ادارے یا میڈیا، حکومت کی اجارہ داری میں ہوتے ہیں، یا نیم اجارہ داری میں ہوتے ہیں، وہاں ان لوگوں کو، جو اقلیتی نظریات رکھتے ہیں، نکال دینا حقیقی جبر کے برابر سمجھا جاتا ہے۔

برداشت اور سچائی کی تلاش

ایک آزاد معاشرے میں برداشت اور رواداری، آئیڈیالوجیکل اختلافات کی برداشت سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے۔ مثلاً، اس میں اظہار کی آزادی شامل ہے، جیسے کہ تقریر، تحریر، نشر یا دوسرے ذریعے، جن کا مطلب سینسرشپ کا موجود نہ ہونا ہے۔

کچھ لوگ ایک ایسی دنیا کو جہاں سینسرشپ نہ ہو، بہت پریشان کن سمجھ سکتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو، ان لفظوں، تصویروں، دلیلوں، اور خیالات سے شدید صدمہ پہنچ سکتا ہے، جنھیں ایک آزاد دنیا میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک آزاد معاشرے میں ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اظہارِ رائے کی آزادی کو یا لوگوں کی رائے کو روکیں، خواہ جو کچھ کہا جاتا ہے، ہم سب اس سے اختلاف رکھتے ہوں، یا یہ ہمیں قابلِ نفرت لگتا ہو یا ہم اسے غیر اخلاقی سمجھتے ہوں۔

بلاشبہ، اظہارِ رائے کی آزادی پر اس وقت پابندیاں لگانی ہوں گی، اگر جو کچھ کہا جاتا ہے وہ دوسروں کے لیے خطرے کا سبب بنتا ہے، جیسے کہ کسی تھیٹر میں ''آگ'' پکارنا۔ ہم اسے جائز طور پر سزا دیں گے، جو اسی طرح لاپروائی سے دوسروں کو جسمانی نقصان پہنچانے کے خطرے کا سبب بنتا ہے۔ اسی طرح، ہم بچوں کو ایسے لفظوں یا تصویروں سے محفوظ رکھتے ہیں، ہماری رائے میں جو انھیں خراب کرسکتی ہیں۔ ہم نشہ آور چیزوں کے ظاہری اشتہارات کی اجازت نہیں دے سکتے، جیسے کہ سکولوں کے نزدیک بڑے بڑے بورڈوں کی صورت میں۔ اور لوگوں کو یہ معلومات دینے کا معاملہ بھی بالکل درست ہے، جیسے کہ فلموں کی مختلف قسموں میں درجہ بندی، تاکہ وہ نہ جانتے ہوئے کہیں ان سے دوچار نہ ہو جائیں، جو انھیں بددل کریں گی۔

نہ ہی ہم سینسر کرنے والوں پر بھروسہ کرسکتے ہیں۔ سچائی اور طاقت دو مختلف چیزیں ہیں۔ جو طاقت میں ہوتے ہیں، کچھ خیالات کو نشر ہونے سے ممنوع قرار دینے کی ان کی اپنی وجوہات ہوسکتی ہیں، جیسے کہ خود اپنی بقا۔ مانا کہ سینسر کرنے والوں کا دلی مقصد لوگوں کا مفاد ہوتا ہے، مگر وہ غلطی کرنے سے بچ نہیں سکتے۔ دانائی پر ان کی اجارہ داری نہیں، نہ ہی ان کے پاس سچائی کیا ہے اور کیا نہیں ہے، اس کا کوئی خاص علم ہے۔ اس کا تعین صرف بحث، دلیل اور تجربہ کرے گا۔ سینسر کرنے والے سچائی کو غلطی سے دبا سکتے ہیں۔ انھیں کبھی اس بات کا یقین نہیں ہوسکتا کہ وہ ایسے خیالات کا راستہ روک رہے ہیں، جو آخرِ کار درست ثابت ہوں گے۔ بعض خیالات زیادہ تر غلط ہوں گے، لیکن پھر بھی ان میں کچھ نہ کچھ سچائی تو ہوگی، جسے دلیل باہر لاسکتی ہے۔ دوسرے خیالات کی سچائی صرف بعد میں وقت کے ساتھ ظاہر ہوسکتی ہے۔

اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ ہم سچے اور مفید خیالات کا راستہ نہ روک سکیں، تمام خیالات کا اظہار ہونے دینا چاہیے، اور یہ اعتماد رکھنا چاہیے کہ بحث کے ذریعے ان کی خوبیاں یا خامیاں سامنے آئیں گی۔ اس کا مطلب لوگوں کو اپنے مقدمے کے حق میں دلیل دینے کی اجازت دینا ہے، ایسے معاملات پر بھی، جنھیں اکثریت یقینی سمجھتی ہو۔ سچائی صرف ایسے مقابلے ہی سے

مضبوط ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1587ء سے 1983ء تک، رومن کیتھولک چرچ کسی ایسے شخص کے خلاف مقدمہ پیش کرنے کے لیے 'شیطان کا وکیل' (ڈیولز ایڈووکیٹ) مقرر کیا کرتا تھا، جسے سینٹ بنایا جاتا ہوتا تھا۔ ہم جن باتوں پر یقین رکھتے ہیں، ان پر سوالات اٹھانا مفید ہوتا ہے۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرے اپنے نظریات میں غلط ہیں، تو ان نظریات کو رد کرنے کے بجائے سامنے لانا چاہیے، انھیں خاموش نہیں کرانا چاہیے۔

سقراط کے بعد سے تاریخ ایسے لوگوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہے، جنھیں ان کے نظریات کی بنا پر ایذا دی گئی۔ ایسی ایذا رسانی عام طور پر لوگوں کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیتی ہے، قطع نظر اس سے کہ ان کے خیالات بعد میں درست ثابت ہو جاتے ہیں۔ رومن کیتھولک چرچ کے غضب کے خوف سے نکولس کاپرنیکس نے اپنے انقلابی نظریے کو 1543ء میں اپنی وفات سے قبل شائع نہیں کیا کہ سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کے پیروکار گیلیلو گیلیلی پر 'تفتیشات' (اِن کویزیشن) نے مقدمہ چلایا اور اس نے اپنے باقی دن اپنے گھر گرفتاری میں گزارے۔ ایسی خوفزدگی، سچائی، بحث اور ترقی کو دبا دیتی ہے۔ یہ معاشرے کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ انحراف کرنے والوں کو نقصان پہنچاتی ہے، جنھیں ظلم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اگر ہم ان خیالات کو کسی دلیل کی اجازت دیئے بغیر بس قبول کر لیں، جو رائج ہوتے ہیں، تو ان خیالات کی بنیاد بہت غیر محفوظ ہوتی ہے۔ ان کی قبولیت غیر تنقیدی ہوتی ہے۔ یہ بامعنی سچائیوں کے بجائے ایسی چیز بن جاتے ہیں جو دہرانے کے لیے ہوتی ہے۔ اور آخرِکار جب نئے خیالات سامنے آتے ہیں، تو پھر یہ توڑ پھوڑ اور اکھاڑ پچھاڑ کرتے آتے ہیں۔

عوامی اور نجی طرزِ عمل

ایک آزاد معاشرے کے قاعدے، پبلک (عوامی) کے طرزِ عمل کو طے کرتے ہیں، یعنی یہ کہ افراد ایک دوسرے کے ساتھ کیسے پیش آتے ہیں۔ لیکن نجی طرزِ عمل، جو صرف اسی فرد پر اثر انداز ہوتا ہے، ایک نجی دائرے میں رہتا ہے۔ یہ صرف اس وقت ایک قانونی معاملہ بنتا ہے،

جب یہ دوسروں کے لیے نقصان کا سبب بنتا ہے۔

لیکن ایک آزاد معاشرے میں محتاط رہنا بہت ضروری ہوتا ہے کیونکہ واقعی نقصان یا نقصان کا خطرہ حقیقی ہوتا ہے۔ کیا لوگوں کو زہر بیچنے کی اجازت ہونی چاہیے؟ یہ بات اپنی جگہ کہ زہر کے بہت سے استعمال، انسانوں کے لیے نقصان دہ نہیں ہوتے، اور ان کی فروخت کی اجازت دینے کی نسبت انھیں ممنوع قرار دینے سے زیادہ نقصان ہوسکتا ہے۔ جو لوگ زہر بیچتے اور خریدتے ہیں، ان کے نام کا ریکارڈ رکھنا درست ہوگا، تاکہ زہر دینے والوں کو پتا ہو کہ ان کے پکڑے جانے کا امکان ہے؛ لیکن اس سے زیادہ نہیں۔

لیکن ایسی تمام سرگرمیاں جو زیادہ تر ان لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہیں، جو ان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے لوگ ان کے خیال سے ہی نفرت کر سکتے ہیں، لیکن اگر ہم کسی قسم کی بھی بنیادوں پر سرگرمیوں پر پابندی کی اجازت دینے لگیں، بجائے اس کے کہ دوسرے لوگوں کو جو خارجی نقصان پہنچے، اس کی بنیاد پر پابندی کی اجازت دیں، تو اخلاق پسندوں سے کوئی سرگرمی محفوظ نہیں رہے گی۔

تاہم، ایک آزاد معاشرے میں لوگوں کو خود اپنی ملکیت سے متعلق قاعدے خود بنانے کی اجازت دی جاتی ہے، شرط یہ ہے کہ کسی کو 'کوئی نقصان نہیں' کے اصول کو نہ توڑا جائے۔ بہت سے ملکوں میں، کچھ پبلک جگہیں (جیسے کہ شاپنگ مال) سیاسی حکام کے کنٹرول میں ہونے کے بجائے، نجی ملکیت میں ہوتی ہیں۔ اسی لیے 2005ء میں جنوب مشرقی انگلینڈ کے بلیو واٹر سینٹر نے قسم کھانے، سگریٹ پینے، لیف لیٹ پھینکنے اور ایسے کپڑے پہننے پر پابندی لگا دی، جو چہرے کو چھپا دیتے ہوں (جیسے کہ ہُڈ)۔ بورن وِل، مرکزی انگلینڈ کے فیکٹری ٹاؤن میں، جسے چاکلیٹ بنانے والے جارج کیڈبری نے بنایا تھا اور جسے ایک نجی ٹرسٹ چلاتا تھا، اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے، شراب کی کھلی فروخت کی اجازت نہیں دی تھی۔ چونکہ بلیو واٹر اور بورن وِل نجی ملکیت ہے، تو انھیں ایسا کرنے کا پورا حق ہے۔

ایثار پسندی (بے غرضی) کا مسئلہ

بہت سے لوگوں کو یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ آزاد معاشرے اور آزاد معیشتیں لوگوں کے ذاتی مفاد کی بنیاد پر چلتی ہیں۔ اس کے بجائے وہ ایک ایسی دنیا کو ترجیح دیں گے، جو ایثار پسند ہو، جو کہ دوسروں کی بہبود اور مفاد کے بارے میں بے غرضانہ تعلق پر مبنی ہو۔ لیکن یہ مسائل کو حل کرنے کے بجائے ان میں اضافہ کرتا ہے۔

دوسروں کی مدد کے لیے کوئی گائیڈ موجود نہیں

چلیں دیکھتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کے مفاد میں کیا چیز ہے، ہم اس کے بارے میں کیسے جان سکتے ہیں۔ ان کے ذہنوں اور قدروں تک ہماری کوئی براہِ راست پہنچ نہیں۔ اگر ہم ایسا کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو ان کے مفاد میں ہے، تو ہم یقیناً بہت بڑی غلطی کر رہے تھے۔ جس کسی کو بھی کبھی اپنی سالگرہ پر کوئی غیر مناسب تحفہ ملا ہوگا، وہ جانتا ہوگا کہ یہاں تک کہ اس کے خاندان والے اور دوست کسی شخص کے ذوق کے بارے میں کتنا لاعلم ہو سکتے ہیں۔ مدد کرنے کا کلچر ایک بے سود بنیاد معلوم ہوتی ہے، جس پر پورے معاشرے کو چلایا جائے۔

ان چیزوں کے بارے میں بھی تنقید پسند ہونا مشکل ہوتا ہے، جو دوسرے لوگ ہمیں دیتے ہیں۔ ہم تحفوں کو ظاہری شکریے کے ساتھ قبول کرتے ہیں، گو کہ ہم انھیں ناپسند کرتے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایثار پسند معاشرے میں لوگوں کو درست طور پر کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ دوسرے حقیقت میں کیا چاہتے ہیں۔ یہ اس معیشت کے بالکل الٹ ہے، جو ذاتی مفاد پر تعمیر ہوتی ہے، جہاں گاہک جو کچھ چاہتے ہیں اگر رسد کاروں سے انھیں وہ چیز نہ ملے، وہ ایسا کہہ دیتے ہیں، اور اپنے کاروبار کو کہیں اور لے جانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ ذاتی مفاد رسد کاروں کو اس بات پر توجہ دلاتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، لوگوں کو وہی چیزیں ممکنہ طور پر سستی سے سستی مہیا کریں، جو وہ چاہتے ہیں۔

ایثار پسندی (بے غرضی) تنازعے کو جنم دیتی ہے

اگر کاروباری لین دین کا محرک لوگوں کی مدد کی ارادی کوشش ہوتی، تو خریداروں اور فروخت کرنے والوں کے درمیان اتنی ہی کھینچا تانی ہوتی، جتنی آج کی ذاتی مفاد کی دنیا میں ہے۔ خریدنے والے اونچی قیمتوں کا مطالبہ کرتے تاکہ بیچنے والوں کو فائدہ ہو۔ بیچنے والے قیمتوں کو نیچا رکھتے تاکہ خریدنے والوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔ یہ اسی شیشے کا عکس ہے، جو کچھ آج ہو رہا ہے۔

ایک منڈی کی معیشت میں، ذاتی مفاد کے حامل لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کشمکش میں ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنی کشمکش کو سودے بازی کے ذریعے حل کر لیتے ہیں۔ اگر صرف یہی محرک ہوتا کہ دوسروں کی مدد کی جائے، تو تنازعوں کو حل کرنے کا کوئی راستہ نہ ہوتا۔ ہر ایثار پسند دوسروں کو بہتر دیکھنے پر اصرار کرتا۔ کیونکہ کوئی بھی لین دین سے فائدہ حاصل کرنا نہیں چاہتا، لہٰذا، خود ان کی اپنی ضرورتوں کی شدت، انھیں متفق نہیں ہونے دے گی۔

ذاتی مفاد اور لاگت-فائدہ

ذاتی مفاد، مہیا کرنے والوں، اور گاہکوں پر بھی حاوی ہوتا ہے، جو اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ لین دین پر آنے والی لاگت کے مقابلے میں فائدے زیادہ ہونے چاہییں۔ ایک ایثار پسند رسد کار، جو کسی صلے کے لیے کام نہیں کرے گا، ہر کسی کے لیے ایک گمراہ کن اشارہ بھیجے گا، یعنی یہ اشارہ کہ ان کے وقت اور مہارت کی لاگت صفر ہے۔ وہ گاہک، جو اس اشارے کو اسی طرح سمجھیں گے، وہ رسد کاروں پر اپنی زیادہ سے زیادہ طلب کا بوجھ ڈال دیں گے۔ رسد کار کسی خدمت کے مہیا کرنے سے انکار نہیں کر پائیں گے، گو کہ اس کا فائدہ بہت تھوڑا ہی کیوں نہ ہو یا اس کی لاگت بہت کم ہی کیوں نہ ہو۔

مثلاً، چمڑے کا کام کرنے والوں کو چیزوں کی مرمت کے لیے لوگوں کی نا ختم ہونے قطاروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ذاتی مفاد پر مبنی منڈی کی معیشت میں، ایسے تاجر گاہکوں کو صاف صاف بتا دیں گے کہ ان کی اشیا مرمت کے قابل نہیں، یا پھر وہ اس کی بہت اونچی قیمت مانگیں گے

کہ گاہک اس کے بارے میں سوچے گا بھی نہیں۔ منڈی، طلب کا بندوبست کرتی ہے، اور اس چیز پر کوشش صرف کرتی ہے، جو حقیقتاً قابلِ قدر ہو۔

ایک ایثار پسند (بے غرض) دنیا میں، لوگ ہمسائیوں کی مدد کی خاطر ہر طرح کا کام کرنا چاہیں گے، جیسے کہ گھر کی تعمیر۔ لیکن عملی طور پر اور لاگت اور اس کے موثر ہونے کے بارے میں، ہمسائے کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ وہ مارکیٹ جائے اور پیشہ ور مستری لے آئے، بجائے اس کے کہ دوستوں کی محنت پر انحصار کرے، جنھیں اس کام کی کوئی مہارت حاصل نہیں۔ یہ نقصان بہت بڑھ جاتا ہے، اگر یہ ہمسائے اپنی محنت کو کسی اور قسم کے دوسرے کاموں میں زیادہ موثر طور پر استعمال کر سکیں۔ منڈی اس بات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ لوگ اپنے وقت اور مہارتوں کو وہاں استعمال کریں، جہاں اس کی قدر سب سے زیادہ ہو۔

سوال: کیا ہمیں قیمتوں کو کنٹرول نہیں کرنا چاہیے تا کہ غریب لوگ چیزیں خرید سکیں؟

جواب: نہیں۔ قیمتیں، کمیابی یا کمی کے اشارے ہوتے ہیں۔ یہ ہمیں بتاتی ہیں کہ کہاں زیادتی ہے اور کہاں کمی۔ یہ پیداکاروں کو بتاتی ہیں کہ کونسی شے کی زیادہ ضرورت ہے، اور صارفوں کو بتاتی ہیں کہ انھیں کہاں بچانا ہے یا کہاں متبادل چیزیں ڈھونڈنی ہیں۔ قیمتوں پر جو کنٹرول قائم کیے جاتے ہیں، وہ ان اشاروں کو دبا دیتے ہیں، اور یوں طلب، رسد سے بڑھ جاتی ہے اور چیزوں کی کمی ہو جاتی ہے۔ اس کا عام نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کمیاب اشیا کی راشننگ کر دی جاتی ہے، جو مزید بگاڑ پیدا کرتی ہے۔

ایک مثال گھروں کے کرائے پر عائد کیے جانے والے کنٹرول ہیں، جن کا مقصد گھروں کی فراہمی ہے۔ لیکن یہ کرتے کیا ہیں کہ گھروں کی فراہمی بدترین ہو جاتی ہے یا گھروں کی دستیابی ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ گھروں کے مالک یہ سمجھتے ہیں کہ مقررہ کرائے ان کے لیے قابلِ قدر نہیں، اور وہ اپنی جائیداد کو کرائے کی مارکیٹ میں سے ہٹا لیتے ہیں۔ اگر کچھ لوگ لازمی چیزوں کا خرچ نہیں اٹھا سکتے، تو بہترین حل یہ ہے کہ مارکیٹ کے میکانزم میں مداخلت نہ کی جائے، بلکہ انھیں پیسہ دیا جائے، یا نجی فلاحی اداروں کے ذریعے یا پھر لوگوں کے ٹیکسوں پر مبنی کم از کم آمدنی سکیم کے ذریعے۔ یوں وہ اسی کارآمد مارکیٹ اور مقابلے پر مبنی مارکیٹ سے یہ چیزیں خرید سکتے ہیں، جیسے ہر دوسرا فرد کرتا ہے۔

مارکیٹ کی اخلاقیات

یہ حقیقت کہ آزاد منڈی کی معیشت ذاتی مفاد پر مبنی ہوتی ہے، اسے غیر اخلاقی نہیں بناتی۔ منڈیوں میں لوگ صرف دوسروں کے ساتھ تعاون کر کے خوشحال ہو سکتے ہیں، یوں کہ لوگ جو چیزیں وہ چاہتے ہیں، انھیں وہ چیزیں مہیا کریں۔ سماج دشمن طرزِ عمل کو سزا کا نشانہ بنایا جاتا ہے: کوئی کسی ایسے فرد کے ساتھ تجارت کیوں کرے، جو بدتمیز ہے، جبکہ مارکیٹ میں ایسے لوگ

کثرت سے موجود ہیں، جو با اخلاق ہیں اور کاروبار کرنے پر راضی ہیں؟

ایسے قاعدے بھی ہیں جو اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ مارکیٹ ہموار طریقے سے اور بغیر کسی جبر یا دھونس کے کام کرے۔ مگر رسمی قاعدے ہر مخصوص معاملے سے نبٹ نہیں سکتے۔ منڈیاں ہمیشہ بھروسے پر چلتی ہیں، اور وہ ان لوگوں کو صلہ دیتی ہیں، جن کی ساکھ قابلِ اعتبار اور قابلِ اعتماد کی بنتی ہے۔ اس کے باوجود کہ اصل محرک ذاتی مفاد ہے، منڈیاں باہمی طور پر فائدہ مند اخلاقیات کو فروغ دیتی ہیں۔

کارپوریٹ سوشل رسپانسبلیٹی (کاروباری سماجی ذمے داری)

بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ کاروبار زیادہ اخلاقی طور پر کام کریں، اور وہ 'کارپوریٹ سوشل رسپانسبلیٹی' (کاروباری سماجی ذمے داری) کو فروغ دیں۔ بہت سے بڑے بین الاقوامی کاروبار اب اپنی سالانہ رپورٹیں چھاپتے ہیں، جس میں وہ بتاتے ہیں کہ وہ اچھے شہری بننے کے لیے کیا کر رہے ہیں۔

لیکن صرف افراد ذمے دار یا غیر ذمے دار، اخلاقی یا غیر اخلاقی ہو سکتے ہیں۔ گروہوں کی خود اپنی کوئی علاحدہ اخلاقیات نہیں ہوتی۔ ایک ملک، ایک قصبہ، ایک نسل، ایک قبیلہ، ایک کلب یا ایک کمپنی اخلاقی یا غیر اخلاقی نہیں ہو سکتی، صرف اس کے انفرادی رکن اخلاقی یا غیر اخلاقی ہو سکتے ہیں۔ یقیناً، ہم چاہیں گے کہ کاروباری لیڈر اپنی تنظیموں میں ایک اخلاقی کلچر تعمیر کریں۔ لیکن اخلاقیات اور ذمے داری کا اظہار اعمال میں ہوتا ہے، اور اعمال، افراد سے تعلق رکھتے ہیں، گروہوں سے نہیں۔

کارپوریٹ سوشل رسپانسبلیٹی کی تحریک اصل میں شہری اور ویلفیئر پروگراموں کی لاگت کو کاروباروں کو منتقل کرنے کی ایک کوشش ہے۔ کاروبار یہ دکھانے کے لیے کہ وہ کتنے ذمے دار ہیں، مقامی سکولوں، کمیونیٹی کے گروپوں، وغیرہ، کو فنڈز دیتے ہیں۔ ان کے لیے اس میں ایک اچھا کاروباری مفہوم ہو سکتا ہے: یعنی آخرِ کار انھوں نے مقامی سکولوں سے بھرتی کریں گے، اور

ان کے ساتھ ایک مثبت تعلق بنانا بھرتی کو آسان تر بنا سکتا ہے۔ لیکن اسے ایک کاروباری فیصلہ ہونا چاہیے، جسے افسران اور حصے دار اپنی مرضی سے کرتے ہوں، اور جسے اخلاقیات کے نام پر ان پر تھوپا نہ گیا ہو۔

اگر کاروبار میں مناسب طور پر مقابلہ موجود ہے، تو ان کے پاس کوئی زائد پیسہ موجود نہیں ہوگا، جسے وہ مقامی منصوبوں کو دے سکیں، جو کاروبار کے امکانات کو بڑھا نہیں سکتے۔ اگر فرموں کے پاس ایسے منصوبوں کے لیے زائد پیسہ موجود ہو، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مارکیٹ کام نہیں کر رہی (مثلاً، حکومتی ضابطے کمپنیوں کو مقابلے سے بچا رہے ہیں)۔ ایک ایسی مارکیٹ میں، جہاں حقیقت میں مقابلہ موجود ہے، وہ فرمیں جو مقامی منصوبوں کے دکھاوے پر خرچ کریں گی، اور یوں نتیجے کے طور پر حاصل ہونے والے نفعے کو کم کرلیں گی، وہ دوسری کمپنیوں کے سامنے ہار جائیں گی۔

نہ ہی کاروباری لوگ خاص طور پر اس بات کو یقینی بنانے میں اچھے ہوتے ہیں کہ جو پیسہ وہ کمیونیٹی کے منصوبوں کے لیے دیں گے، وہ بہتر طور پر خرچ کیا جائے گا۔ ان کے لیے بہتر مشورہ یہی ہوگا کہ وہ نفع کمانے کے اپنے بنیادی کردار پر توجہ دیں، اور لوگ اصل میں جو اشیا و خدمات چاہتے ہیں، انھیں وہ مہیا کر کے زیادہ سے زیادہ نفع کمائیں، جو چیز اس طرح عمومی دولت کو جنم دے گی، جو فلاحی کام کو ممکن بناتی ہے۔

آٹھواں باب

نجکاری اور عالمگیریت

ہجرت اور ٹیکنالوجی

ایک کھلتی ہوئی دنیا

دنیا کے وہ کونے جنھیں کبھی دوردراز سمجھا جاتا تھا، اب وہ دوردراز نہیں رہے۔ ٹیلی وژن، ریڈیو، انٹرنیٹ اور دوسرے رابطوں نے دوسری ثقافتوں، طرزِ حیات، نسلوں، لوگوں، ملکوں اور حکومتی نظاموں کو ہمارے قریب تر کر دیا ہے۔ ہوائی سفر اور تیز رفتار زمینی ٹرانسپورٹ نے ہمارے لیے زیادہ جگہوں کو خود دیکھنا ممکن بنا دیا ہے۔

اس چیز نے حکومتوں کے لیے اپنی خامیوں کو چھپانا زیادہ مشکل کر دیا ہے۔ اب کسی حکومت کے لیے اس امید میں اپنے علاقے کے اردگرد دیوار تعمیر کرنے کا کوئی جواز نہیں رہا کہ وہ اپنے شہریوں کو خود اپنی غلطیوں سے لاعلم رکھ سکے۔ سوشل میڈیا یا غیر ملکی ٹی وی کی بدولت، جو سیٹیلائٹ ڈشوں کی صورت میں کام کرتا ہے، روزمرہ رابطے کے ذریعے، وہ شہری کسی بھی جگہ موجود شاندار مواقع سے پہلے ہی باخبر ہو جاتے ہیں۔

نتیجے کے طور پر، بہت سے ملکوں نے دنیا سے بند رہنے کی اپنی کوششیں ختم کر دی ہیں۔ وہ اب سیاحوں اور دوسرے لوگوں کے لیے کھل رہے ہیں۔ گذشتہ چند دہائیوں میں، روس، چین، ویٹ نام، برما (میانمار) جیسے اہم اور بہت سے دوسرے ملک، بین الاقوامی برادری کے زیادہ کھلے رکن بن گئے ہیں۔ آج، افغانستان کی آبادی کا پانچواں حصہ اپنی زندگیوں کا کچھ حصہ غیر ملکوں

میں گزار چکا ہے۔

خیالات کا تبادلہ

یہ صرف لوگ ہی نہیں جو اس نئی دنیا میں سفر کرتے ہیں، ان کے ہمراہ خیالات بھی گھومتے پھرتے ہیں۔ سیاح مختلف دنیاؤں کی کہانیاں ساتھ لاتے ہیں، جن میں لوگوں کو عمل کی، سوچنے کی اور بولنے کی آزادی ہوتی ہے۔ مقامی لوگ غیر ملکوں میں جاتے ہیں، اور یہ جان کر حیران ہوتے ہیں کہ ان سیاحوں کی کہانیاں صحیح ہیں۔ اگر لوگ انٹرنیٹ یا سیٹیلائٹ ٹی وی تک پہنچ رکھتے ہیں، تو جو کہانیاں وہ سنتے ہیں، سکرین پر ان کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

تجارت کا اثر بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر ایک ملک کو بین الاقوامی تجارت کے لیے کھول دیا جائے، تو اس ملک کے لوگ خود کو کاروبار کرتا ہوا پاتے ہیں، اور مختلف ثقافتوں کے لوگوں کے دوست بن جاتے ہیں، اور زندگی کے دوسرے طریقوں کو سمجھنے لگتے ہیں۔

یہ چیز حکومتوں پر مزید دباؤ ڈالنے کا سبب بنتی ہے کہ وہ زیادہ کھلی پالیسیاں اختیار کریں۔ وہ لوگ، جو آزادی کو دیکھتے ہیں اور خود اس کا تجربہ کرتے ہیں، وہ اس بات کو سمجھتے لگتے ہیں آزادی کیسے ترقی کو بڑھاوا دیتی ہے اور خوشحالی کو پھیلاتی ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ ترقی اور خوشحالی چاہتے ہیں۔ ٹیکنالوجی، تجارت، ہجرت، سیاحت، اور عالمی منڈی، یہ سب ایک آزاد معاشرے کے سفیر ہیں۔

ایک آزاد معاشرے کی نشوونما

اوپر سے نیچے کی سرمایہ پسندی نہیں

جہاں پہلے ایک آزاد معاشرہ موجود نہیں تھا، وہاں ایک آزاد معاشرہ تخلیق کرنا آسان کام نہیں۔ نئی حکومتیں اور بین الاقوامی امدادی ایجنسیاں اکثر بڑی اور شاندار تبدیلیاں چاہتی ہیں، جیسے کہ ساری بیوروکریسی کے نظم ونسق کی تبدیلی، یا بڑی بڑی حکومتی صنعتوں کی نجکاری۔

یہ طریقہ اکثر تباہی لاتا ہے۔ اختیار کو اپنے ذاتی فائدے کے لیے استعمال کرنے کے

کلچر کی موجودگی، اور مارکیٹوں اور مقابلے کی مقامی سمجھ بوجھ کے بغیر، بہت سی نجکاریوں کے اقدام (جیسے کہ میکسیکو میں 1980ء کی دہائی میں ہوا) بس یہ کرتے ہیں کہ ریاستی اجارہ داریوں کو اپنے حواریوں کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں۔ لوگوں کے لیے، یہ حواری پسند سرمایہ داری، ریاست کی حواری پسندی سے کچھ مختلف چیز نہیں ہوتی، جو پہلے موجود تھی۔ اور چونکہ انصاف کے نظام کی اصلاح میں دہائیاں لگ سکتی ہیں، ایسی حواری پسندی کو عدالتیں چیلنج ہی نہیں کرتیں۔ لہٰذا، لوگ اس نجکاری کے حل سے اتنے ہی مایوس رہتے ہیں، جتنا وہ ریاستی کنٹرول کے مسئلے سے مایوس ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ یقین کرتے لگتے ہیں کہ صرف انتہا پسندوں اور انقلابیوں کے پاس ہی کوئی نئی بات ہے، جو اشرافیہ کے بجائے لوگوں کو فائدہ پہنچا سکتی ہو۔

آزادی کے نیچے سے اوپر آنے والے محرکات

'اوپر سے نیچے کی سرمایہ پسندی' کا نظریہ ناکام ہو جاتا ہے کیونکہ یہ سماجی اداروں کو ظاہری طور پر تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جبکہ بنیادی رویے، اعمال اور ترغیبیں تبدیل نہیں کیں جاتیں، جو انھیں بناتی اور استحکام دیتی ہیں۔

ایک آزاد معاشرے کی تخلیقیت اور ترقی ان قانونی اور اخلاقی ضابطوں سے نشو ونما پاتی ہے، جو اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ لوگ زندہ کیسے رہتے اور آزادانہ طور پر مل جل کر تعاون کیسے کرتے ہیں۔ اگر ہم اعمال کے قاعدوں کا ایک ایسا ڈھانچہ متعارف کروا سکیں، اور لوگوں کو ان قاعدوں کے اندر رہتے ہوئے اپنی زندگیاں خود گزارنے کے لیے آزاد چھوڑ دیں، تب تمام لوگوں کی فطری توانائی اور امنگ منظّم تبدیلی کا محرک بن جائے گی۔

مثال کے طور پر، فرض کریں ہم لوگوں کے لیے نیا کاروبار شروع کرنا، اعتماد کے ساتھ کاروبار کا مالک ہونا اور اسے چلانا، جائیداد کی محفوظ ملکیت رکھنا، پیداواری سرمایہ تعمیر کرنا، اور آزادنہ تجارت کرنا، ان چیزوں کو آسان بنا دیتے ہیں۔ ایسا کرنے سے ہم قاعدوں اور ترغیبوں کو تخلیق کرتے ہیں، جو جلد ہی معاشی نشو ونما اور منظّم سماجی اصلاح کو جنم دینے لگیں گے۔ لوگ

چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے لگیں گے، یہ چیز سیکھنے لگیں گے کہ کاروبار کیسے کیا جائے اور خوشحال کیسے ہوا جائے، اور یوں نہ صرف مالی فائدہ حاصل کریں گے، بلکہ ان میں زیادہ اعتماد بھی پیدا ہوگا۔ ایک زیادہ بااعتماد معاشرہ، ایسے بڑے بڑے اداراتی معاملات کے ساتھ نبٹنے کے زیادہ قابل ہوگا، جیسے کہ بیوروکریسی کی اصلاح اور حکومتی صنعتیں۔

لہٰذا، ہمیں ریاستی اداروں کی مکمل اصلاح کی کوشش کو بڑی سطح سے شروع نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں چھوٹی سطح سے شروع کرنا چاہیے ترغیبیں دے کر، جو پورے اداراتی ڈھانچے میں منظّم تبدیلی کا محرک بنیں گی۔

ملکیتی حقوق عمل میں

پیرو میں ملکیتی حقوق

پیرو میں ملکیتی حقوق کی اصلاح ایک دلچسپ مثال ہے، جس کا آغاز معیشت دان ہرنانڈو ڈی سوٹو نے 1990ء کی دہائی کی ابتدا میں کیا۔ ڈی سوٹو کو یہ شکایت تھی کہ پیرو کی بیوروکریسی اور کرپشن کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک نئے کاروبار کو رجسٹر کرانے کے لیے قریباً ایک برس لگ جاتا ہے۔ اسی طرح جائیداد کی ملکیت رکھنا مشکل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ لاکھوں چھوٹے کاروباری اپنے فارم، یا کاروبار یا گھر کے قانونی مالک نہیں تھے۔ یہ چیز ان کے لیے قرض لے کر اپنے کاروبار کو بڑھانے کو مشکل بناتی تھی۔ وہ اپنے گھر یا کاروبار کو بیچ نہیں سکتے تھے۔ اور وہ اپنے ملکیتی یا کاروباری تنازعوں کے حل کے لیے عدالتوں میں نہیں جا سکتے تھے۔

پیرو میں عملاً دو معیشتیں تھیں، ایک جو قانون کے اندر تھی اور جائز ہونے اور قانونی تحفظ کی وجہ سے معاشی فائدے حاصل کرتی تھی، اور دوسری وہ جو لاکھوں کاروباریوں پر مشتمل تھی، جو غربت کا شکار تھے، کیونکہ ان کے گھر اور کاروبار قانونی طور پر موجود ہی نہیں تھے۔ حکومت کو ریونیو نہیں ملتا تھا، کیونکہ یہ ماورائے قانون چھوٹے کاروباروں سے متعلق ٹیکس کا تخمینہ لگا سکتی تھی نہ

ہی ٹیکس جمع کر سکتی تھی ۔ اور چونکہ انھیں کوئی قانونی تحفظ حاصل نہیں تھا ، جرائم پیشہ لوگ اور ''شائننگ پاتھ'' گوریلا گروہ ان کاروباریوں کا استحصال کرتے تھے۔

ڈی سوٹو اور دوسرے لوگوں نے جو حل پیش کیا، وہ زیادہ تر ایسے بیوروکریٹک ضابطوں کو ختم کرنا تھا، جو نئے کاروبار کی رجسٹریشن سے تعلق رکھتے تھے۔انھوں نے بیشتر لائیسنسوں اور پرمٹوں کو بھی ختم کر دیا، کاروبار چلانے کے لیے جن کا حاصل کرنا ضروری تھا۔ زمینی اصلاحات بھی کی گئیں، جن کے ذریعے پیرو کے دس لاکھ خاندانوں نے پہلی مرتبہ تسلیم شدہ زمین حاصل کی جوان کے نام تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹے کاروباروں کی کارکردگی بڑھ گئی، کیونکہ مالک اب کاروبار کو بڑھانے کے لیے ادھار لے سکتے تھے، اور جائیداد خرید اور بیچ سکتے تھے۔ جیسے جیسے لوگوں کے پاس سرمایہ اور بچت جمع ہوئیں، گھروں کے معیار میں بہتری آئی، اور والدین اپنے بچوں کی تعلیم پر زیادہ اخراجات کرنے لگے۔

ایسا نہیں کہ ان اصلاحات پر تنقید نہیں ہوئی ۔ کچھ لوگوں نے دلیل دی کہ زمینی حقوق درست نہیں تھے، کیونکہ یہ طے کرنا مشکل تھا کہ کون کس کا غیر رسمی 'مالک' تھا۔ دوسروں کا دعویٰ تھا کہ زمینی حقوق نے چھوٹے پیمانے کے قبضہ گیروں کے مقابلے میں بڑے قبضہ گیروں کو فائدہ پہنچایا۔ اور یہ کہ زمینی حقوق نے ان عام زمینوں کو ہضم کر لیا، جن پر غریب کسانوں کا انحصار تھا۔ یا یہ کہ زمینی حقوق نے عرصہ جاتی بندوبست (گو کہ یہ غیر رسمی تھا) کو نقصان پہنچایا، جو واقعتاً بہت فائدہ مند تھا۔ کچھ اور نے یہ دلیل دی کہ زمینی اصلاحات کوئی 'جادو کی چھڑی' نہیں تھیں، اور معاشی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹیں وہ مجبوریاں تھیں، جو لوگوں کے کلچر نے ان کی امنگوں پر مسلط کی ہوئی تھیں۔

ایک ایسی مارکیٹ قائم کرنا، جو کامیابی کے ساتھ کام کر رہی ہو، کبھی آسان نہیں ہوتا، جبکہ پہلے کوئی موجود بھی نہ رہی ہو۔ ایک ایکویریم سے مچھلی کا سوپ بنانا آسان ہوتا ہے، لیکن مچھلی کے سوپ سے ایکویریم بنانا آسان نہیں۔ تاہم، دوسرے ملکوں نے پیرو کی اصلاحات کو اپنے ملکوں

میں نقل کرنے کی کوشش کی ہے، اور خود ڈی سوٹو نے لاطینی امریکہ اور افریقہ دونوں میں بہت سے ملکوں کو مشاورت مہیا کی ہے۔

اصلاحات کی حمایت

لیکن گو کہ کارآمد قسم کے ملکیتی حقوق نہایت اہم ہیں، دوسری اصلاحات بھی یقیناً ضروری ہیں، جو انھیں سہارا دیتی ہیں۔ مثلاً، ایک کامیاب طور پر چلتی ہوئی قرضے اور چھوٹے قرضوں کی مارکیٹ بھی ضروری ہے، جسے بھاری بھرکم ضابطے اور بیوروکریسی ناکام بنا سکتی ہیں۔ (چھوٹے قرضوں کی ایک دلچسپ مثال بنگلہ دیش کا گرامین بینک ہے، جو دیہی کاروباروں کو چھوٹے قرضے مہیا کرتا ہے، اس میں ایسے قرضے بھی شامل ہیں، جن کی مدد سے کاروبار کرنے والی بے زمین عورتیں وائرلیس ٹیلی فون استعمال کرتے ہوئے ''پے فون'' کا کاروبار قائم کر سکتی ہیں۔)

ایک ایسا کامیاب قانونی نظام بھی چاہیے ہوتا ہے، جس پر لوگ اعتبار کر سکتے ہوں، تاکہ لوگ تنازعوں کو تیزی سے اور اعتماد کے ساتھ طے کر سکتے ہوں۔ ہمیں اس وقت کا انتظار نہیں کرنا کہ کب قانون ساز ریاستی قانونی نظام میں مخصوص اصلاحات عمل میں لائیں۔ کامن لا، جو انفرادی مقدمات پر تعمیر ہوتا ہے، کہیں زیادہ تیز رفتاری سے کام کرتا ہے، اور مقامی قانونی نظام بھی پہلے ہی موجود ہوتا ہے، جس کے پاس تسلیم شدہ نظیروں کا پورا دفتر موجود ہوتا ہے، جو مقامی لوگوں کے انصاف کے مفہوم کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ ہم وہ بنیادی قاعدے طے کریں کہ کاروبار کیسے چلانا ہے، جیسے کہ ملکیتی ڈھانچے، شخصی ذمے داری، حصہ داروں کے حقوق، اور دیوالیہ ہونے سے متعلق بندوبست۔

ہمیں ضابطوں میں کمی لانے کی ضرورت ہے، جو مارکیٹ میں داخلے میں رکاوٹ بنتے ہیں، تاکہ نئے خیالات سامنے آسکیں۔ مثلاً، نیپال جو کہ ایک ایسا ملک ہے، جو 1950ء کی دہائی سے پہلے باہر کی دنیا کے لیے ایک بند ملک تھا، اس کے حاکموں نے اپنے ٹیلی فون کے نظام کی فروخت کو اس بنیاد پر مسترد کر دیا کہ لوگ اس خیال سے خوف زدہ ہو جائیں گے کہ کوئی نجی کمپنی

اسے چلا رہی ہے۔ مگر انھوں نے نئے لائیسنس جاری کرنے سے اتفاق کیا، جس نے نئے لوگوں کو داخلے کی اجازت دی۔ یہ نئے آنے والے اتنے کامیاب ہوئے کہ اب نیپال کے پاس ایک سٹیٹ آف دا آرٹ قابلِ رشک ٹیلی فون کا نظام ہے۔

چھوٹے کاروباری اور مارکیٹ میں نئے آنے والوں کی مثالیں جتنی زیادہ ہوتی ہیں، جو پھل پھول رہے ہوتے ہیں، نوکریاں پیدا کر رہے ہوتے ہیں، خوشحالی کو بڑھا رہے ہوتے ہیں اور گاہکوں کی خدمت میں بہتری لا رہے ہوتے ہیں، لوگوں کو اتنا زیادہ یہ سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہ آزادی میں آمدنی اور دولت تخلیق کرنے کی کتنی طاقت چھپی ہوئی ہے۔ آزادی کو جتنی زیادہ حمایت ملے گی، لوگ انتہا پسندانہ، اور آخرِ کار جبر پر مبنی متبادل چیزوں کی خواہش اتنی ہی کم کریں گے۔

زرعی اصلاحات

ملکیتی حقوق جب عمل میں آتے ہیں تو ان کی جو طاقت سامنے آتی ہے، اس کی مثال سوویٹ روس، چین اور ویٹ نام میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی کمیونسٹ حکومتوں نے زراعت کو زمین اور فارم کے کاروبار کو مشترک ملکیت کے گرد تعمیر کیا۔ زمین کے استعمال اور اس پر کام کرنے کے حقوق کمیون کے کنٹرول میں ہوتے تھے، اور وہ تقسیم کا ایک مساوات پسندانہ نظام مسلط کرتے تھے۔ لیکن یہ بالکل ناکام تھا۔ کمیون بہت بڑے، بے سود اور بیورو کریٹک تھے۔ اور کیونکہ افراد کو اپنی کوشش کا حاصل بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ بانٹنا پڑتا تھا، لہٰذا، ان کے پاس سخت محنت کرنے یا زیادہ پیداوار کرنے کی کوئی ترغیب نہیں تھی۔

اگرچہ چین نے کمیون کی ملکیت کے اس اصول کو چھوڑنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا، لیکن انھوں نے 1970ء کی دہائی میں سوویٹ روس سے لیے گئے اس تباہ کن ماڈیل سے جان چھڑا لی۔ اس کی جگہ ایک 'گھریلو ذمے داری نظام' لایا گیا، جس میں خاندان زمین کے خود اپنے مخصوص ٹکڑے پر کام کرتے تھے۔ اس چیز نے کوشش اور صلے کے تعلق کو بحال کر دیا۔ چین کی

زراعت پھلنے پھولنے لگی۔ 1980ء کی دہائی کی ابتدا میں فارم کی پیداوار تیزی کے ساتھ بڑھی، اور اناج کی پیداوار میں سالانہ 5 فیصد، کاٹن میں 8 فیصد اور تیل کے بیجوں میں 14 فیصد اضافہ ہوا۔

لیکن یہ ابتدائی پیداوار برقرار نہیں رہی۔ نظام میں ابھی بھی خرابی تھی۔ زمین کی کوالیٹی میں جو فرق تھے، حکام نے انھیں برابر کرنے کی امید میں، خاندانوں کو زمین کے ایک بڑے ٹکڑے کے بجائے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دیے تھے۔ ہر خاندان کی کوشش پانچ یا چھ پلاٹوں پر پھیلی ہوتی تھی، اور بہتر طریقے متعارف کروانا مشکل تھا۔ یہاں تک کہ پلاٹوں کے درمیان رستے کاشت کی ہوئی زمین کا ایک بڑا حصہ لے لیتے تھے۔ اور تقسیم کا نظام، خاندانوں کی پیداواریت میں فرق پر بالکل توجہ نہیں دیتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ زمین کی تکنیکی ملکیت کو ویسے کا ویسے ہی رہنے دیا گیا، بلکہ زمین کے استعمال کے حق کا نظام متعارف کروایا گیا۔ یعنی خاندانوں کو زمین پر طویل عرصے تک کام کرنے، فصلیں حاصل کرنے اور اس سے آمدنی حاصل کرنے، اور پھر یہ حقوق دوسروں کو منتقل کرنے کا حق دیا گیا۔

پھر وہی بات کہ یہ نظام آزاد مارکیٹ اور ملکیتی حقوق کے نقطۂ نظر کی رو سے مکمل نہیں تھا۔ چونکہ فصلیں ریاست خرید لیتی تھی اور قیمتیں بھی وہی مقرر کرتی تھی، اس چیز نے خاندانوں کی اس اہلیت کو نقصان پہنچایا کہ وہ فیصلے خود کریں، اور اپنی محنت کے سارے پھلوں سے لطف اندوز ہوں۔ زمین کی ایک حقیقی مارکیٹ کے بغیر، چھوٹے چھوٹے پلاٹوں کو اکٹھا کرنے کا کام بہت کم تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ زمین کے استعمال کی مارکیٹ جیسی چیز کھلتی گئی۔

مثال کے طور پر، میتان، شمالی گیژو کے دیہی علاقے میں، گاؤں والوں اور حکام نے زمین کے استعمال کے عرصے کو بیس برس مقرر کیا، یوں خاندانوں کو طویل عرصے کی منصوبہ کرنے میں مدد ملی۔ کسانوں کو زمین کو ورثے میں چھوڑنے، عرصے کے تبادلے، اور زمین کے ٹکڑوں کو جوڑنے کا اختیار دیا گیا۔ اور غیر کاشت شدہ زمین کو کام میں لانے کے لیے ترغیبیں دی گئیں۔ اس

کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ زمین پر کاشت کاری کی گئی، زمین کی کوالیٹی میں بہتری آئی، کیونکہ خاندان زمین کی دیکھ بھال کرتے تھے، اور جدید آلات متعارف کروائے گئے۔ 1995ء میں، قومی حکومت نے دوسرے گاؤوں کو ییتان کی مثال پر عمل کرنے کے لیے کہا، اور زمین کے ملکیتی حقوق کے نظام جیسی ایک چیز پھیلنی شروع ہوئی۔

پانی کے حقوق

پانی ایک اور کمیاب وسیلہ ہے، جسے حکومت کے بجائے ملکیتی حقوق بہتر طریقے سے کام میں لا سکتے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ کے خشک مغربی علاقے میں، پہلے خشک سالی کا خطرہ عام ہوا کرتا تھا، پانی کی کمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اسے مہیا کرنے کے نظام میں بہت زیادہ ضابطوں کی موجودگی کی وجہ سے۔ مثال کے طور پر، جو لوگ کسی ندی سے پہلے پانی حاصل کرتے تھے، انھیں بعد میں آنے والوں پر ترجیح حاصل تھی۔ لیکن اپنے اس حق کو برقرار رکھنے کی خاطر انھیں مسلسل پانی حاصل کرنا ہوتا تھا، قطع نظر اس سے کہ ان کی پانی کی ضرورت بہت کم ہو گئی ہو۔

1990ء کی دہائی کے شروع میں، مونٹانا اور ایریزونا جیسی ریاستوں نے لوگوں کو اپنے پانی کے حق کی تجارت کی اجازت دی۔ گو کہ ابھی بھی بہت سے ضابطے موجود ہیں، جو اس مارکیٹ کو پابند بناتے ہیں، اس چیز نے اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ پانی وہاں جاتا ہے، جہاں اس کی قدر سب سے بڑھ کر ہے۔ چونکہ پانی سے متعلق حق کو خریدا اور بیچا جا سکتا ہے، پانی کم استعمال کرنے والے لوگ (جو کم پانی استعمال کرتے ہیں، ری سائیکلڈ پانی کو استعمال کرتے ہیں)، اب اپنے تازہ پانی حاصل کرنے کے حقوق کو زیادہ ضرورت مند لوگوں کو منتقل کرتے ہیں۔ یہ ہیں اس نظام کے فائدے کہ اب پانی کے حقوق کی مارکیٹ پورے مغربی امریکہ میں پھیل چکی ہے۔

نجکاری کی میکانکیت

ریاست کی ملکیت میں ہونے والی صنعتیں اکثر اجارہ داریاں ہوتی ہیں، جو گاہکوں کو انتخاب کا حق نہیں دیتیں۔ یوں وہ کم تر اشیا اور خدمات کے لیے اونچی قیمتیں مانگ سکتی ہیں اور

مانگتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ حاکموں کے بہت قریب ہوتی ہیں، اوران کا انتظام کوئی ایجینسی کررہی ہوتی ہے، پھر بھی عام طور پر یہ حاکم اشرافیہ یا ان کے دوستوں کے کنٹرول میں ہوتی ہیں۔

مثلاً، ایران کی 'بنیادز' کہنے کو فلاحی ٹرسٹ ہیں، یہ پراپرٹی ڈیویلپمنٹ، زراعت، مینو فیکچرنگ، اور شپنگ کے شعبوں میں، ایرانی معیشت کے پانچویں حصے کوکنٹرول کرتی ہیں۔ ان کا بانی اصل میں شاہ تھا، حقیقت میں فلاحی نہ ہونے، اور خود انتظامیہ کی سرپرستی اور نفعے کے ایک ذریعے کی حیثیت سے ان پر بہت تنقید کی جاتی ہے۔ تاہم، 1979ء کے انقلاب کے بعد، آنے والی حکومت نے انھیں بہت پرکشش سمجھا اور ختم نہیں کیا۔ لہٰذا، یہ ابھی بھی موجود ہیں، اور انھیں ٹیکس میں خصوصی چھوٹ اور حکومتی سبسڈی بھی ملتی ہے: اصل میں جس نجی جائیداد کو ضبط کیا گیا، اسے ان میں شامل کردیا گیا۔ ان کا مقصد تو غریبوں کا فائدہ ہے، مگر ان سے فائدہ اٹھانے والے اصل لوگ وہ ہیں، جو بااختیار ہیں۔

ریاست جن کاروباروں کو چلا رہی ہوتی ہے، ان کی نجکاری کے نتیجہ خیز اثر کو بیورو کریٹک اجارہ داریوں میں نجی ملکیت اور مقابلے کو متعارف کروانا چاہیے، اور کرپشن کی جگہ کاروباری کھلے پن کو لانا چاہیے۔ اس طرح ان صنعتوں کے سرمائے کو پبلک کو واپس لوٹانے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ حاصل کرنے کی خاطر، وژن، صبر اور محتاط پالیسی سازی چاہیے۔

کوئی ایک میکانزم موجود نہیں۔ ریاست کے ملکیتی کاروباروں کی نجکاری، سیاست کے ساتھ ساتھ معیشت کا معاملہ بھی ہے۔ ہر صنعت مختلف ہوتی ہے اور ایک مختلف انداز چاہتی ہے۔ صنعتوں کی قسم اور سائز مختلف ہوتا ہے، اوران میں کی جانے والی اصلاحات کو روکنے والے مفاداتی گروہ مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا، ایک یوٹیلیٹی جیسے کہ پانی یا بجلی کے لیے، جو طریقہ اختیار کیا جائے گا، جس پر ساری آبادی انحصار کرتی ہے، وہ کسی مینوفیکچرنگ کمپنی کی نسبت بالکل مختلف ہوگا، جہاں نسبتاً چند لوگ متاثر ہوتے ہیں۔

چھوٹے کاروباروں کے معاملے میں، انھیں کسی ایسے کاروباری کو بیچ دینا عملی ہوسکتا

ہے، جو خاص طور پر غیر ملکی ہو، جو تازہ خیالات اور سرمایہ لا سکتا ہو۔ لیکن ریاستی کمپنیوں کو غیر ملکیوں کو بیچنا متنازع ہو سکتا ہے۔

بڑے کاروباروں کے معاملے میں، ملکیت کو حصص کی فروخت سے، وسیع پیمانے پر لوگوں میں تقسیم کرنا فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے بہت وسیع پیمانے پر تعلیم کی ضرورت ہو سکتی ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے سٹاک مارکیٹ بہت محدود ہو، اور خاصے لوگوں کو پتا ہی نہ ہو کہ حصص کیا ہوتے ہیں۔ سوویٹ نظام کے خاتمے کے بعد، روس نے ''واؤچر پرائیوٹائزیشن'' کا آغاز کیا، جس نے لوگوں کو ریاستی کاروباروں میں موثر طریقے سے برابر حصص دیے۔ لیکن بہت سے لوگوں نے ان حصص کو سستا بیچ دیا، اور یہ کنٹرول، کاروباری خانوادوں کے ایک نئے اشرافی طبقے کی صورت میں سامنے آیا۔

مارکیٹ کے اصولوں کو متعارف کروانا

اجارہ داریوں کو ٹکڑوں میں بانٹنا نجکاری کے عمل کے لیے لازمی ہے۔ حکومتیں سوچ سکتی ہیں کہ انھیں اس صورت میں زیادہ ٹیکس ملیں گے، جبکہ وہ کاروباروں کو ان کی اجارہ دارانہ مراعات سمیت فروخت کریں گی، لیکن اس طرح اجارہ داری کی طاقت عام لوگوں کے لیے پہلے کی طرح بری رہتی ہے۔ اگر ایک ریاستی اجارہ داری کو ایسے حصوں میں تقسیم کیا جائے، جن میں مقابلہ موجود رہے، تو حکومت اور لوگوں دونوں کو اس کا طویل مدتی فائدہ ہوگا۔ نئے کاروبار، اپنے اجارہ دارانہ پیش روؤں کی نسبت، زیادہ صحت مند، متحرک اور جدت پسند ہوں گے۔

گوئٹے مالا میں 1996ء میں ٹیلی فون سسٹم کی جو نجکاری ہوئی، وہ نجکاری کے عمل میں مقابلے کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ وہاں ٹیلی کام کی اجارہ داری کی نجکاری سے پہلے ٹیلی کام مارکیٹ کو کھولا گیا۔ ایئر ویوز (Airwaves) کی بھی نجکاری کی گئی، اور یوں الیکٹرومیگ نیٹک شعبے میں موثر طریقے سے ملکیتی حقوق پیدا ہوئے، جنھیں نئی کمپنیاں آسانی سے خرید اور استعمال کر سکتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقابلے میں بے حد اضافہ ہوا، اور یوں انتخاب کی آزادی زیادہ بڑھی

اور پھیلاؤ بھی زیادہ ہوا۔ قیمتیں پورے لاطینی امریکہ کی نسبت کم ہوگئیں، اور صرف ایک دہائی کے اندر موبائل ٹیلی فون کے استعمال کرنے والوں میں کئی سو گنا اضافہ ہوا۔

اسے درست کیسے کیا جائے

بین الاقوامی تجربہ اور مہارت دونوں کثرت سے دستیاب ہیں، جس کی مدد سے اصلاح کرنے والے نجکاری کی سیاست اور میکانکیت کو درست کر سکتے ہیں۔

بنیادی چیز یہ ہے کہ پراسیس کو مکمل طور پر کھلا ہونا چاہیے اور یہ کہ لوگوں کو اس میں شامل ہونا چاہیے۔ دوسری صورت میں، اصلاح کو عمومی طور پر قبول نہیں کیا جائے گا۔ مثلاً، افریقہ کی کچھ حکومتوں نے غیر ملکی سرمایہ کاروں کو بلا کر یوٹیلیٹی صنعتوں، جیسے کہ پانی اور بینکنگ کی نجکاری کی، لیکن ملکیت کے مواقع کو مقامی آبادی کے لیے نہیں کھولا۔ یہ چیز نہ صرف سیاسی سادہ لوحی ہے، بلکہ آزاد معاشرے کے مساوی سلوک کے اصول کے بھی خلاف ہے۔

مزید یہ کہ اگر ملکیت کو محدود رکھا جاتا ہے، بجائے اس کے کہ اسے پھیلایا جائے، اس کا خطرہ باقی رہتا ہے کہ جن صنعتوں کی نجکاری کی گئی ہے، وہ ان لوگوں کے حواریوں کے کنٹرول میں واپس چلی جائیں گی، جو حکومت میں ہوں گے۔ یہ چیز مزید نجکاری کے خیال کو زہر آلود بنا دے گی، اور حکومتی کنٹرول میں ہونے والے دوسرے شعبوں میں مارکیٹ کے اصولوں کو متعارف کروانے کو پیچھے لے جائے گی۔ لوگوں کو اس بات کا یقین دلانا ضروری ہے کہ کوئی بھی نیا ڈھانچہ کرپٹ اشرافیہ کو فائدہ پہنچانے کے بجائے، گاہکوں کی خدمت کرے گا۔ اس بات کی ضمانت یوں دی جا سکتی ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو اور جتنا زیادہ ممکن ہو، اتنا زیادہ مقابلے کو متعارف کروایا جائے۔

حکومت کے بغیر انسانی خدمات

یہ ایک مفروضہ ہے کہ کچھ پبلک خدمات صرف حکومت مہیا کر سکتی ہے، خاص طور پر صحت، تعلیم اور ویلفیئر کی 'انسانی' خدمات۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایسی لازمی خدمات اتنی اہم ہیں کہ انھیں مارکیٹ پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اصل میں، یہ اتنی اہم ہیں کہ انھیں حکومت پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ جب خدمات مہیا کرنے والوں کو اپنی سرمایہ کاری کا پیسہ، ٹیکسوں میں سے ملتا ہے، تو انھیں اپنی روزی کمانے کے لیے گاہکوں کی خوشنودی نہیں چاہیے ہوتی، جیسا کہ نجی خدمات مہیا کرنے والوں کی صورت میں لازماً ہوتا ہے، جہاں مقابلہ موجود ہوتا ہے۔ اپنے بجٹ کو بڑھانے کا ان کا طریقہ سیاست دانوں کو اپنے ساتھ ملانا ہوتا ہے، یا اگر ان کے مطالبات پورے نہ کیے گئے، تو رکاوٹ ڈالنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ ان کی توجہ حکومت پر ہوتی ہے، لوگوں پر نہیں۔

حکومتی خدمات کی نسبت، نجی فرم کو عام طور پر بہت زیادہ مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اکثر حکومتی خدمات کے ساتھ مقابلے کو واقعتاً غیر قانونی قرار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا، حکومتی شعبوں کو جدت نہیں لانی پڑتی، یا اپنی خدمات کو تازہ ترین بھی بنانا نہیں پڑتا۔ کیونکہ ان کے گاہک کہیں اور نہیں جاسکتے۔

لیکن پھر بھی حکومتیں جتنا زیادہ پبلک خدمات کو خود چلانا چاہتی ہیں، لوگ ہمیشہ ان کی اجارہ داریوں سے علاحدہ راستے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ دنیا بھر میں کثرت سے ایسی مثالیں موجود ہیں، جہاں غیر حکومتی اور غیر رسمی خدمات مہیا کرنے والوں نے اہم ترین خدمات مہیا کیں اور کہیں بہتر مہیا کیں۔

حکومت کے بغیر تعلیم

مثال کے طور پر تعلیم کو لیں۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نجی تعلیم صرف دولت مندوں کے لیے ہے۔ لیکن بھارت، گھانا، نائیجیریا اور کینیا کے دو سالہ مطالعے سے ماہر تعلیم پروفیسر جیمز ٹولی کو یہ بات سمجھ آئی کہ حقیقت اس کے الٹ ہے۔ ان ملکوں کے غریب ترین علاقوں میں، سکول جانے والے بیشتر بچے غیر حکومتی سکولوں میں جا رہے تھے۔ حیدر آباد، اکرا اور لاگوس کے غریب ترین حصوں میں، صرف ایک تہائی یا اس سے بھی کم سکول حکومتی سکول تھے۔ دو تہائی یا اس سے بھی

زیادہ سکول جانے والے بچے نجی سکولوں میں جاتے تھے، جن میں سے بہت سے غیر منظور شدہ تھے، یعنی جنھیں حکومت تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ان میں سے بیشتر غیر حکومتی سکولوں کو نجی مالک چلاتے تھے۔ ان میں سے بہت ہی کم سکولوں کو فلاحی امداد ملتی تھی، اور ریاستی فنڈز تو کسی کو نہیں ملتے تھے۔ والدین جو فیس ادا کرتے تھے، جو اکثر بہت کم ہوتی تھی، وہی ان سکولوں کی واحد آمدنی تھی۔

ٹولی کو یہ بھی پتا چلا کہ نجی سکولوں میں طلبہ کی کارکردگی کہیں زیادہ اچھی تھی۔ حیدر آباد میں، پانچویں کے طلبہ کا ریاضی کا اوسط سکور، حکومتی سکولوں کے طلبہ کی نسبت زیادہ تھا، اس حقیقت کے باوجود کہ نجی شعبے میں اساتذہ کو ملنے والی تنخواہ حکومتی شعبے کے مقابلے میں نصف اور ایک چوتھائی تھی۔ اسی طرح دوسرے معیار بھی اونچے تھے۔ ٹولی نے حکومتی سکولوں کے اساتذہ کو اپنے ڈیسکوں پر سوتے ہوئے دیکھا۔ اور اساتذہ کی غیر حاضری کے اعتبار سے حکومتی سکولوں کی حالت بدتر تھی۔ نجی سکولوں میں بلیک بورڈ، کھیل کے میدانوں، ڈیسکوں، پینے کے پانی اور بیت الخلا کی فراہمی بہتر تھی۔ (صرف نصف حکومتی سکولوں میں بیت الخلا دستیاب تھے، جبکہ اس کے مقابلے میں، 96 فیصد یا اس سے زیادہ نجی سکولوں میں بیت الخلا دستیاب تھے۔) حکومتی سکولوں کے مقابلے میں ان سکولوں میں شاگرد-استاد تناسب نصف کے قریب تھا۔

حکومتیں، غریب علاقوں میں نجی تعلیم کی اہمیت سے بے خبر معلوم ہوتی ہیں۔ چینی حکومت کے مطابق گنسو کے پہاڑی صوبے میں صرف 44 نجی سکول تھے، جبکہ ٹولی کے تحقیق کرنے والوں نے ایسے 696 سکولوں کا پتا چلایا، جن میں سے 593 سکولوں میں 61,000 بچے زیر تعلیم تھے، جو دور دراز پہاڑی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی بڑی اکثریت کو والدین اور گاؤں والے چلاتے تھے۔ یہ سکول اس حقیقت کے باوجود کامیاب تھے کہ گنسو میں اوسط آمدنی 150 ڈالر فی سال تھی۔ کیبرا، کینیا میں، جو سب سہارا افریقہ کی سب سے بڑی غریبوں کی بستی ہے، جس کی آبادی 750,000 کے قریب قریب ہے، ٹولی کو 76 نجی سکولوں کا پتا چلا، جن میں 12,000 طلبہ داخل تھے۔

صاف بات ہے کہ دنیا کی غریب ترین جگہوں پر، نجی کوشش تعلیم مہیا کر سکتی ہے اور کرتی ہے، جس کا معیار ریاست کی نسبت بہت اونچا ہوتا ہے۔ اور اس کی لاگت کافی کم ہوتی ہے، اور خاندان اس کا خرچ اٹھانے کے قابل ہوتے ہیں۔ تعلیم میں حکومت کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔

اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ حکومت کے تحت چلنے والے وسیع سکول پروگرام اکثر تعلیم میں کچھ نہ کچھ مقابلے کو متعارف کروانے میں دلچسپی رکھتے ہیں، اور اس بات کو بھی یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ یہ انتخاب خود والدین کے پاس ہو کہ وہ اپنے بچوں کو کس سکول میں لانا چاہتے ہیں۔ 1991ء میں سویڈن نے ایک نیا پروگرام متعارف کروایا، جس کے تحت حکومت سکولنگ کی بنیادی لاگت کی ادائیگی کرتی تھی، مگر نجی غیر منافع بخش اور منافع بخش گروپ خود اپنے سکول قائم کر سکتے اور فنڈنگ حاصل کر سکتے تھے، مگر اس کی بنیاد ان شاگردوں کی تعداد تھی، جنھیں وہ اپنے سکولوں میں لا سکتے تھے۔ یہاں تک کہ اساتذہ کی یونینیں، جو شروع میں اس پروگرام کے خلاف تھیں، اب اس کی حمایت کرتی ہیں۔ وجہ اس کی ہے کوئی ہزار سے زیادہ ان نئے سکولوں کی کارکردگی، جدت پسندی اور کوالیٹی، جو خاص طور پر نہایت مشکل اور غریب ترین علاقوں میں شروع ہوئے۔ اب دوسرے ملک اسی ماڈیل کو متعارف کروا رہے ہیں۔

حکومت کے بغیر حفظانِ صحت

حفظانِ صحت ایک اور اہم خدمت ہے، جس کی فراہمی پر بہت سے ملکوں میں حکومت چھائی ہوئی ہے، اور جسے اکثر قانونی تحفظ، ٹیکس کے پیسوں میں سے سبسڈی دے کر اور ضابطوں کی مدد سے، مقابلے سے بچایا جاتا ہے۔ مزید، یہ چیز ریاستی خدمت مہیا کرنے والوں کی توجہ کو حکومت سے زیادہ پیسہ اور زیادہ مراعات حاصل کرنے پر مرکوز کرتی ہے، بجائے اس کے کہ وہ مریضوں کو اچھی خدمت مہیا کریں۔

ریاست ہائے متحدہ کو اکثر اس کے مفروضہ 'آزاد مارکیٹ' پر مبنی حفظانِ صحت کے نظام کی بنیاد پر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یقیناً اس کی لاگت زیادہ ہے؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا بھر

کے نظاموں میں ایک ایسا نظام ہے، جہاں ضابطوں کی بھرمار ہے، اوراس کے حفظانِ صحت پر آنے والے فی کس حکومتی اخراجات، دنیا بھر میں سب سے زیادہ اخراجات میں (ناروے اور لکسمبرگ کے بعد) تیسرے درجے پر ہیں۔ٹیکس اورضابطوں کے قاعدے صحت کی انشورنس کو کام کی جگھوں سے باندھے ہوئے ہیں،اس کا مطلب ہے کہ جب لوگ نوکریوں کے درمیان میں ہوتے ہیں، ان کی انشورنس نہیں ہوتی ۔ جبکہ ملازمین ٹیسٹوں اور علاج کی مانگ کرتے ہیں (ڈاکٹر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں)،حقیقتاً جس کی انھیں ضرورت نہیں ہوتی ، کیونکہ اس کی لاگت ان کے آجر ادا کرتے ہیں ، وہ خودنہیں۔ ضابطے یہ بھی ہدایت کرتے ہیں کہ میڈیکل انشورنس کے معاہدوں میں کیا کچھ شامل کیا جائے ، اور یہ کہ اسے کیسے فروخت کیا جا سکتا ہے (مثلاً، انشورنس کوصرف ان کی رہائشی ریاست تک محدود کرنا، انھیں کم لاگت اور زیادہ پیداوار کی معیشت کے حصول سے روکنا)۔اسی طرح ،میڈیکل پریکٹس کولائیسنس کے تقاضوں کی پابندی کرنی پڑتی ہے،جنھیں خود ڈاکٹر طے کرتے ہیں ، اوریوں اس پیشے میں ڈاکٹروں کی رسد کو پابند کرتے ہیں اور ان کی فیسوں کو زیادہ رکھتے ہیں ۔ یہ سب (اور دوسری بہت سے) ضابطے ریاست ہائے متحدہ کے حفظانِ صحت کی لاگت کو بڑھاتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں، سنگاپور، جوایک چھوٹا سا ملک ہے اور واقعتاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے زیادہ دولت مند ہے ، امریکہ کے فی کس اخراجات کا چھٹا حصہ حکومتی صحت کے پروگراموں پرخرچ کرتا ہے۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ خاندان اپنی آمدنی کا قریباً پانچواں حصہ مستقبل میں حفظانِ صحت (گو کہ سانحے کی صورت میں طبی ضروریات کے لیے حکومتی فنڈز پر مبنی ایک پروگرام موجود ہے)، ریٹائرمینٹ اور گھریلو لاگت کے لیے بچائیں ۔ یہ حقیقت کہ لوگ خود اپنے حفظانِ صحت کے بچت اکاؤنٹ میں خود اپنا پیسہ بچاتے ہیں، یوں ان کی توجہ اس بات پر رہتی ہے کہ وہ اپنے پیسے کی اچھی قدر حاصل کریں ، اورنجی ڈاکٹر اور کلینک ان کی مرضی کے لیے مقابلہ کرتے ہیں۔

سوئٹزرلینڈ میں، حکومت کی طرف سے مہیا کی جانے والی کوئی انشورینس نہیں: لوگ نجی انشورینس مہیا کرنے والوں سے انشورینس اور میڈیکل خدمات حاصل کرتے ہیں۔ حکومت کا کردار سبسڈی دینے کی حد تک محدود ہے، جو مہیا کرنے والوں کو نہیں، بلکہ مریضوں کی دی جاتی ہے، جو بنیادی حفظانِ صحت کے خرچ کو خود برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا، امریکہ کے برخلاف، سوئز شہری، حفظانِ صحت پر جو کچھ خرچ کرتے ہیں، وہ اس پیسے کی قدر حاصل کرنے پر توجہ دیتے ہیں۔ بہت سے یورپی سوئٹزرلینڈ کے آزاد مارکیٹ کے نظام کو دنیا میں حفظانِ صحت کا بہترین نظام خیال کرتے ہیں۔

حکومت کے بغیر بہبود

کسی غریب شخص کے لیے بہبود کی بہترین شکل ایک ایسی نوکری ہے، جہاں اسے ادائیگی کی جاتی ہے۔ لیکن حکومت کی چلائی جانے والی بہبودی سکیمیں، نوکریوں کو تباہ کر دیتی ہیں۔ زیادہ تر یورپ میں، 'سوشل انشورینس' کے لیے ان لوگوں کو ایک خاص ٹیکس دینا پڑتا ہے، جو کام کرتے ہیں، یوں آجروں کے لیے لاگت بڑھ جاتی ہے اور وہ نئے کارکنوں کو بھرتی کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے زیادہ لوگوں کو بے روزگاری کا فائدہ مل رہا ہے، جس کا مطلب ہے کہ اس کے لیے ٹیکس کو بڑھانا ہوگا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اور کم لوگوں کو نوکریاں ملیں گی۔ یہ ایک نیچے جاتا ہوا چکر ہے۔

سویڈن بیسویں صدی کے درمیان تک ایک آزاد، کم ٹیکس والا اور خوشحال ملک تھا۔ پھر 1970ء سے دو دہائیوں تک یہ بہت اونچے ٹیکس عائد کرنے لگا، تاکہ بہبود کے جامع پروگراموں کے لیے پیسہ مہیا کر سکے۔ (دراصل، 1976ء میں ایک سویڈش مصنفہ نے یہ شکایت کی کہ اس کے مارجینل ٹیکس کی شرح 102 فیصد تک پہنچ چکی ہے۔) ٹیکسوں کی اتنی اونچی شرحیں کام اور کاروبار کے خلاف ترغیب دیتی تھیں۔ ان کی وجہ سے سویڈن دو دہائیوں تک کم نشوونما کا شکار رہا، یہاں تک کہ 1990ء کی دہائی میں پالیسی کو الٹایا گیا۔

آزاد ملک زیادہ دولت مند ہونے کی طرف مائل ہوتے ہیں؛ اور زیادہ دولت مند ملک مستحق افراد کی مدد کے لیے زیادہ اخراجات کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ یہ چیز اخلاقی طور پر صحت مندانہ ہے۔ بجائے اس کے کہ حکومتیں لوگوں سے ٹیکسوں کے ذریعے پیسے لیں اور اپنے تیار کیے ہوئے بہبودی پروگراموں پر خرچ کریں، اور یہ صرف اس لیے اخلاقی طور پر صحت مندانہ نہیں کہ حکومتیں اپنے دوستوں کو فائدہ پہنچانے کی طرف مائل ہوتی ہیں، اور اپنے حریفوں پر ٹیکس مسلط کرتی ہیں۔ حقیقی فلاحی ادارے ایک فرد سے دوسرے فرد کو رضا کارانہ طور پر مہیا کرتے ہیں، جبر کے ذریعے نہیں۔

حکومتی بہبود کے پروگراموں کے ساتھ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ یہ ایک طرح سے محتاجی کا کلچر پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ پروگرام بہت بڑے ہوتے ہیں اور انھیں سرکاری ملازم چلاتے ہیں، تو انھیں لازماً قاعدوں کی بنیاد پر چلایا جاتا ہے، بجائے اس کے کہ جنھیں فائدہ پہنچانا ہے، ان کی ضرورتوں اور ممکنہ فائدے کا ذاتی جائزہ لیا جائے، جیسا کہ حقیقی فلاحی ادارے کرتے ہیں۔ یہ چیز لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ قاعدوں کے ساتھ کھیلیں، تاکہ فائدہ اٹھا سکیں۔ بعض اوقات، غریب خاندان شعوری طور پر اپنے حالات کو خراب تر کر لیتے ہیں، تاکہ وہ زیادہ فائدوں کے حقدار بن سکیں، یہ اس کے الٹ ہوتا ہے، جو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یو کے (UK) جیسے پرانے اور بڑے ملکوں کی فلاحی ریاستوں میں، سرکاری اہل کار اب ایسے لوگ دیکھ رہے ہیں، جن کی تیسری نسل بہبودی وظیفے پر زندگی گزار رہی ہے، یعنی وہ خاندان فائدوں پر زندہ ہیں، جن کے والدین اور والدین کے والدین ان سے پہلے اسی طرح زندہ تھے۔

خود مدد (سیلف ہیلپ)، کہیں زیادہ انسانی، تحریک دینے والی اور موثر متبادل ہے، اور نجی فلاحی ادارے اسے سہارا دیتے ہیں۔ یو کے میں 1940ء کی دہائی سے پہلے، کارکن طبقے کے لیے بہبود کا ایک کامیاب نظام موجود تھا، جسے فلاحی ریاست نے ختم کر دیا۔ یہ دوستانہ انجمنیں تھیں، جس کے رکن ان میں ہفتہ وار چندہ دیتے تھے اور جواب میں انھیں بے روزگاری کی تنخواہ،

میڈیکل انشورینس، اور یہاں تک کہ تدفین کے اخراجات بھی ملتے تھے۔ یہ عام طور پر مخصوص پیشوں پر توجہ دیتے تھے، تاکہ وہ ان کارکنوں کی خصوصی ضروریات کو پورا کرسکیں۔ لاکھوں خاندان، اور خاص طور پر غریب تر خاندان، ان انجمنوں کا رکن بننا پسند کرتے تھے۔ یقیناً حکومت کے بغیر تمام لوگوں کے لیے بہبود حاصل کی جاسکتی ہے۔

فلاحی شعبے کا احیا

بہت سے لوگ جو ایسے ملکوں میں رہتے ہیں، جہاں ویلفیئر کا بہت ترقی یافتہ ریاستی نظام موجود ہے، وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ نجی فیاضی اور فلاح پسندی ممکنہ طور پر اس فیاضی کا متبادل نہیں ہوسکتی تھی، جیسا کہ ٹیکس پر مبنی سماجی فائدے اور پینشن ہیں۔ یقیناً حکومتوں کے لیے دوسروں کے پیسے کے بل پر فیاض ہونا بہت آسان ہے، اور سیاست دانوں کے لیے ہر ترغیب موجود ہے کہ وہ اب بڑے بڑے فائدوں کا وعدہ کریں، گو کہ وہ جانتے ہیں کہ ان فائدوں کی ادائیگی وہ نسلیں کریں گی، جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئیں۔ یہ چیز خود اس بات کی بڑی وجہ ہے کہ سیاست دانوں کو سماجی ویلفیئر سے باہر کیوں رکھا جائے۔ لیکن اس کے علاوہ، اگر ریاست کی طرف سے ملنے والے فائدے بہت زیادہ ہوں، تو خاندانوں کے لیے خود اپنی روزی مہیا کرنے کی ترغیب کم ہوجاتی ہے، اور افراد کے لیے بھی کام ڈھونڈنے کی ترغیب بھی کم ہوجاتی ہے، بجائے اس کے وہ ریاستی وظیفوں پر زندہ رہنے لگتے ہیں، اور ایسا اس وقت اور زیادہ ہوتا ہے، جب جو لوگ کام کرتے ہیں انھیں اس ویلفیئر نظام کو چلانے کے لیے زیادہ ٹیکس دینے پڑتے ہوں۔ گو اس میں نیت بہت اچھی ہے، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں میں امید اور امنگ ختم ہو جاتی ہے اور محتاجی کی زندگی گزارنا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

وہ ملک، جو آزادی کی سمت میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں، انھیں چاہیے کہ اپنے ویلفیئر کے بڑے بڑے ریاستی نظاموں کو چھوٹے چھوٹے اور زیادہ مقامی نظاموں میں تقسیم کرنے سے ابتدا کریں۔ بلکہ انھیں ایک ذاتی قسم کے اکاؤنٹ میں ایک فرد کی حیثیت سے دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ چیز خاندانوں میں خود اپنی ذمے داریوں کا احساس پیدا کرنے میں مددگار ہو سکتی ہے، اور انھیں اس بات کے سمجھانے میں بھی مدد کر سکتی ہے کہ ان کے اخراجات حقیقی ٹیکس دینے والے اٹھا رہے ہیں، نہ کہ کوئی بہت بڑا 'نظام' ہے۔ اور اس نظام کو یوں ٹکڑوں میں تقسیم کرنے سے اس کا انتظام زیادہ کامیاب طریقے سے اور نجی شعبے کے مہیا کرنے والوں کے ذریعے کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال چلی کا پینشن کا نظام ہے۔ 1981ء میں، ملک نے ریاستی پینشن کے اپنے ناکام اور غیر منصفانہ نظام کو ذاتی اکاؤنٹس (کھاتوں) میں تقسیم کر دیا۔ کارکنوں سے اپنی ریٹائرمینٹ کی خاطر بچانے کے لیے کہا گیا، لیکن وہ کئی نجی مہیا کرنے والوں میں سے انتخاب کر سکتے تھے کہ کون ان کے فنڈز کا انتظام چلائے۔ اس نظام نے بچتوں کے بارے میں ذاتی ذمے داری کو فروغ دیا، کارکنوں کے لیے بہتر وصولی کو جنم دیا، اور تب سے اس نظام کو کئی براعظموں کے متعدد ملکوں میں نقل کیا گیا ہے۔

ایک اور مثال ہے سنگاپور کے بچتوں کے صحت اکاؤنٹس کا نظام، جو افراد اور خاندانوں پر خاصی ذمے داری ڈالتا ہے، اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ اپنی حفظانِ صحت اور دوسری ضرورتوں کے لیے خود فراہم کریں۔ یو کے کی پرانی دوستانہ انجمنیں اسی طرح کا ایک اور ماڈیل ہیں، جنھیں ریاستی فائدوں کو ذاتی، نجی اکاؤنٹس کی صورت میں تقسیم کر کے آسانی کے ساتھ دوبارہ جنم دیا جا سکتا ہے۔

جب ریاست کے ناکام ہوتے ہوئے امدادی نظام کی اصلاح اس انداز میں کی جاتی ہے، تو افراد کو کام ڈھونڈنے، خود اپنی کوششوں اور اپنے خاندانوں کی مدد پر انحصار کرنے کی زیادہ ترغیب ملتی ہے، بجائے اس کے کہ وہ ریاست پر انحصار کریں۔ تاہم، فیاضی اور فلاح پسندی کی ضرورت پھر بھی باقی رہے گی، لیکن اب یہ قابلِ انتظام حد کے اندر ہوگا۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، لوگوں کو آزادی دینا اور ان پر کم ٹیکس لگانا ایک اچھا طریقہ ہے، جو انھیں اس قابل بناتا ہے کہ ان میں ارادہ بھی پیدا ہو اور دوسروں کے لیے فیاضی بھی، جو ایک ایسا محرک ہے، جو ایک بڑی

ریاست اور زیادہ اونچے ٹیکسوں کو ختم کر دیتا ہے۔

عالمگیریت اور تجارت

عالمگیریت کے فائدے

نیپال کی طرح، بہت سے ملکوں میں یہ تشویش پائی جاتی ہے کہ بڑھتی ہوئی عالمگیریت انھیں کیسے متاثر کرے گی۔ لیکن یہ تشویش زیادہ تر مناسب نہیں، اور عالمگیریت اور تجارت کے مثبت فائدے بہت اہم ہیں۔

مارکیٹ کے قیمتوں کے میکانزم کی بدولت، ہم بلاواسطہ اور بالواسطہ دونوں طریقوں سے دنیا بھر کے لوگوں کے ساتھ تجارت کر سکتے ہیں۔ ہم جو کپڑے پہنتے ہیں، ہم جو خوراک کھاتے ہیں، ہمارے گھروں، دفتروں اور کارخانوں میں جو ساز وسامان ہے، یہ سب اشیا دور دراز کے بہت سے ملکوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

لیکن مارکیٹوں کی عالمگیریت دونوں طرح سے کام کرتی ہے۔ یہ نہ صرف دولت مند ملکوں کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ ساری دنیا سے چیزیں خریدیں۔ یہ ان ملکوں کے لوگوں کو بھی اس قابل بناتی ہے، جو پہلے دور دراز ہوتے تھے، کہ وہ بین الاقوامی مارکیٹوں میں اپنی اشیا کے لیے جگہ بنا کر اپنے حالات کو سدھاریں۔ مثلاً، ایک مقامی کسان کو کونسی فصل اگانی چاہیے؟ پہلے، فصلوں کے بارے میں معلومات کا ذریعہ، مقامی تاجر یا ریاستی ایجینسیاں ہوتی تھیں، یقیناً ان کے خود اپنے مفادات ہوتے تھے۔ مقامی قیمتوں میں بہت اتار چڑھاؤ آ سکتا تھا، جس کا انحصار موسم جیسے اسباب پر ہوتا تھا۔ اور مقامی مارکیٹیں ہمیشہ بہت زیادہ منظّم نہیں ہوتی تھیں۔ آج، ایک کسان اپنے موبائل کی مدد سے کسی بھی فصل اور دنیا بھر کی لاتعداد مارکیٹوں کے بارے میں جتنی چاہے ویب سائیٹس دیکھ سکتا ہے، جہاں مارکیٹ کی قیمتیں دستیاب ہوتی ہیں، جس میں مستقبل کی قیمتوں کی پیش کش بھی شامل ہوتی ہے۔ ایک کسان جہاں بھی ہو وہ ایک منظّم بین الاقوامی مارکیٹ میں

فروخت کرسکتا ہے، اور کہیں زیادہ قابل پیش بین قیمتوں پر۔

نیوزی لینڈ کا کھولا جانا

نیوزی لینڈ ایک ایسے ملک کی مثال ہے، جس نے لین دین اور تجارت پر لاگو ضابطوں سے جان چھڑائی اور خود کو پورا بدل لیا۔ 1980ء کی دہائی کی ابتدا میں، اس کے معاشی حالات بہت مایوس کن اور مشکل تھے، جس کا بڑا سبب ایسے ضابطے تھے۔ لیکن 1984ء کے شروع میں، اس نے مقامی صنعتوں کی تحفظ پسندی چھوڑ دی اور بین الاقوامی تجارت پر لگے ہوئے ضابطے ختم کر دیے، اور مارکیٹوں کو دنیا بھر کے مقابلے کے لیے کھول دیا۔ صنعت اور زراعت کو جو سبسڈی دی جاتی تھی، اسے ختم کر دیا گیا۔ ملکی مارکیٹ پر جو ضابطے عائد تھے، انھیں ختم کر دیا گیا، جس میں لیبر مارکیٹ پر عائد حد سے زیادہ ضابطے بھی شامل تھے: ٹریڈ یونین کی رکنیت کو رضاکارانہ بنا دیا گیا، اور کارکنوں اور مالکوں کے درمیان معاہدوں کو ان ہی پر چھوڑ دیا گیا۔

لابی کرنے والوں، تدریس کرنے والوں، مذہبی لیڈروں اور یونین کے اہل کاروں کی خوفناک پیشین گوئیاں کہ ضابطوں کا خاتمہ ایک 'سویٹ شاپ' (بیگار خانہ) جیسی معیشت کو جنم دے گا، سب کی سب غلط ثابت ہوئیں۔ اوسط اجرتیں بڑھ گئیں۔ اجرتی معاہدے زیادہ تیزی کے ساتھ طے پانے لگے۔ ہڑتالوں کا اقدام صفر کے قریب ہو گیا۔ بے روزگاری میں کمی آئی، اور ماؤری، مہاجروں (Immigrants) اور دوسرے غریب یا پچھڑے ہوئے گروہوں میں بے روزگاری زیادہ تیزی سے کم ہوئی۔ نیوزی لینڈ دنیا کے ان ملکوں میں سے ایک ملک ہو گیا، جو زیادہ آزاد اور مقابلے والے ملک تھے۔

ثقافتی پہچان

کچھ لوگوں کو یہ بات پریشان کرتی ہے کہ مارکیٹوں کی عالمگیریت ملکوں کو ان کی منفرد پہچان اور منفرد ثقافت سے محروم کرسکتی ہے۔ خاص طور پر، امریکی برانڈوں کا پھیلاؤ ان میں تشویش پیدا کرتا ہے کہ وہ ملک جن کی اپنی علاحدہ پہچان ہے، جب وہ مایوس کن طور پر ایک جیسے نظر آنے

لگیں گے، اور جب مغربی اشیا اور رویے دوسری جگہوں پر حاوی ہو جائیں گے، اور یوں دنیا کی اعلیٰ ترین ثقافتیں کسی کم تر ثقافت کے تحت آ جائیں گی۔

یقیناً، معاشی اور سماجی ثقافتیں بدل رہی ہیں۔ وہ اشیا جو کبھی کسی خاص ملک کے لیے منفرد ہوتی تھیں، اب وہ تمام ملکوں کے بڑے بڑے بازاروں میں مل جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انتخاب کی آزادی اور تنوع غائب ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ملک کے لوگوں کے پاس اب انتخاب کی آزادی کہیں زیادہ ہے، اتنی زیادہ کہ پہلے کبھی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر، انگلینڈ کے شہریوں کو اب بے ذائقہ اور حد سے زیادہ پکا ہوا کھانا نہیں کھانا پڑتا، جس کے لیے یہ ملک پہلے مشہور تھا۔ اب انھیں ریستوراں، ٹیک اوے شاپس، اور سپر مارکیٹیں دستیاب ہیں، جو بھارتی، ویٹ نامی، لاطینی امریکی، ایرانی، منگولین، پولش، اور لاتعداد دوسری قسموں کے کھانے فروخت کرتے ہیں۔ اور دنیا بھر میں دوسرے لوگوں کو اب اسی طرح کے انتخاب کی آزادی حاصل ہے، جو پہلے چند خوش قسمتوں تک محدود ہوتی تھی، جو اتنے دولت مند ہوتے تھے کہ سفر کر سکیں۔ یہ نہیں کہ ثقافتیں گم ہو رہی ہیں؛ بلکہ وہ اس طرح پھیل رہی ہیں کہ ہر کوئی ان سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

ثقافتیں کبھی جامد اور غیر تبدیل شدہ نہیں رہتیں، جیسا کہ ان لوگوں کا مطلب ہے جو عالمگیریت کے خلاف ان کا دفاع کرتے ہیں۔ ایک ملک کی ثقافت ہر وقت تبدیل ہو رہی ہوتی ہے، اور ایک ثقافت جتنی تازہ اور زندہ ہوتی ہے، یہ اتنے ہی زیادہ نئے ثقافتی خیالات کو جنم دیتی ہے، اور اور زیادہ تبدیل ہوتی ہے۔ آج بہت سے شاندار ملکوں کا آرٹ، موسیقی، ادب، طرزِ حیات، ذوق، اور فیشن خود ان لوگوں کے لیے بالکل اجنبی ہوگا، جو بس ایک صدی پہلے ان میں رہتے تھے۔

ثقافتوں کا سامنا جب دوسری ثقافتوں سے ہوتا ہے، تو ان میں زیادہ گہرائی آتی ہے، اور لوگوں کو ایسی چیزوں کے انتخاب کی آزادی ملتی ہے، جو ان کی زندگیوں اور وقت کے لیے زیادہ

مناسب ہوتی ہیں۔ بین الاقوامی تجارت کے ذریعے، ہم دنیا کے ثقافتی عناصر کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں، جنھیں اپنانا ہم خود اپنے لیے مفید سمجھتے ہیں۔ مگر یہ عمل تو اس وقت سے جاری ہے، جب ابھی عالمگیریت کے بارے میں کوئی بھی بات نہیں کر رہا تھا۔

اور زیادہ تر وہ تبدیلی، اور ہماری ثقافت کی بہت سی رنگ برنگ چیزوں کا نقصان، جس کے لیے ہم بہت پچھتاتے ہیں، اس کی وجہ کوئی غیر ملکی ثقافتی سامراج نہیں، بلکہ اس کا سبب جدیدیت کے سادہ اثرات ہیں۔ قدیم تقریبیں، رواج اور قومی لباس غائب ہو جاتے ہیں، عالمگیریت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس لیے کہ خود زندگی تبدیل ہوتی ہے۔ میلے، جو کبھی مخصوص موسموں کا پتا دیتے تھے، کسان آبادیوں کے لیے اہمیت رکھتے تھے، لیکن ایک ایسی دنیا میں ان کی گونج کم ہوگئی ہے، جہاں ہم میں سے آدھے لوگ شہروں میں رہتے ہیں۔

شاید اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ثقافتیں تبدیل ہوتی ہیں۔ دنیا کی بہت سی ثقافتیں، قابض طاقتوں نے لوگوں پر ٹھونسیں تھیں، اور کم آزاد ملکوں کی زیادہ تر ثقافت واقعتاً نقصان دہ ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو خوش آمدید کہنا چاہیے کہ سفر میں آسانی اور سوال اٹھانے کی بڑھتی ہوئی آزادی نے ملکوں کے لیے اس بات کو مشکل بنا دیا ہے کہ ایک ایسی ثقافت کو باقی رکھیں، جس میں کچھ گروہوں سے بدسلوکی کی جاتی ہے، انھیں دبایا جاتا ہے، یا ان کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے۔

سوال: کیا دولت مند ملک دنیا کی بہت زیادہ دولت پر قبضہ نہیں کر رہے؟

جواب: نہیں۔ دولت ایک ایسی چیز ہے، جسے آپ تخلیق کرتے ہیں، مہارت، مہم جوئی، توانائی، کوشش، تنظیم اور سرمایہ کاری کے ذریعے۔ دولت مند ملک یقیناً دولت خرچ کرتے ہیں، مگر وہ اسے تخلیق بھی کرتے ہیں۔ اور صرف خود اپنے لیے نہیں: وہ نہایت اہم اشیا اور پروسیس دریافت کرتے ہیں اور انھیں ترقی دیتے ہیں، جو ہر کسی کی زندگی میں بہتری لاتے ہیں، خاص طور پر اس سیارے پر رہنے والے غریب ترین لوگوں کے لیے۔

مثال کے طور پر، میڈیسن میں ہونے والی ترقی دنیا کی سب سے زیادہ خطرناک بیماریوں جیسے کہ تپ دق اور ملیریا کا خاتمہ کر رہی ہے۔ جینیٹک ٹیکنالوجی نہ صرف اہم فصلوں، جیسے کہ چاول اور دوسری زیادہ استعمال ہونے والی فصلوں کی پیداوار میں اضافہ کر رہی ہے، بلکہ انھیں کیڑوں سے محفوظ رکھنے میں مدد کر رہی ہے۔ نیا تعمیراتی سامان تعمیر کو سستا ترین اور محفوظ ترین بنا رہا ہے۔

دولت کی کوئی مقررہ رسد نہیں ہوتی، جس کے غیر منصفانہ حصے پر دولت مند ملک قبضہ جما رہے ہوں۔ اس کے برعکس، دولت مند ملکوں کی مہارت دوسروں کے لیے نئے مواقع تخلیق کر رہی ہے۔

امن کی اہمیت

ایڈم سمتھ نے لکھا: 'ایک ریاست کو بدترین وحشت کے درجے سے دولت مندی کے اعلیٰ ترین درجے تک لے جانے کے لیے بہت تھوڑے کی ضرورت ہے، جیسے کہ امن، آسان ٹیکس، اور انصاف کا قابل برداشت نظام۔'

ایک پھلتی پھولتی آزاد معیشت کے لیے، ملک اور دنیا میں امن ایک یقینی تقاضا ہے۔

لوگ اس وقت تک کاروبار میں سرمایہ کاری نہیں کریں گے اور سرمایہ پیدا نہیں کریں گے، جب تک انھیں یہ یقین نہ ہو کہ ان کی دولت جنگجو گروہ یا حملہ آور فوج چھین نہیں لے گی۔ اور ایسے ملک جن کے شہری دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارت میں سرگرم ہوں، ان کی کوشش ہوگی کہ ان ملکوں کے ساتھ تنازعہ پیدا نہ کیا جائے۔ انیسویں صدی کے فرانسوی معیشت دان اور سیاست دان، فریڈرک باستیات کا کہنا ہے: ''اگر اشیا سرحدیں پار نہیں کرتیں، تو فوجیں سرحدیں پار کریں گی۔''

امن کے فائدے معاشی بھی ہیں اور ثقافتی بھی۔ امن اس چیز کو ممکن بناتا ہے کہ کوشش اور وسائل کو تباہ کن سرگرمیوں کے بجائے، پیداواری سرگرمیوں پر لگایا جائے۔ یہ ان حالات کو جنم دیتا ہے، جن کے اندر سرمایہ تخلیق ہوتا ہے اور آزاد معیشت پھلتی پھولتی ہے۔ یہ لوگوں کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے اور اپنے خاندانوں کے مستقبل کے بارے میں منصوبہ بندی کر سکیں۔ یہ انھیں وقت، دولت اور اعتماد مہیا کرتا ہے تاکہ وہ ثقافتی اور تعلیمی معاملات میں شریک ہو سکیں۔ اور امن لوگوں، اشیا اور خیالات کی آزادانہ حرکت کو ممکن بناتا ہے، اور یوں افہام و تفہیم، خوشحالی اور جدت کاری کو پھیلاتا ہے۔

ایڈم سمتھ کی ایک اور بصیرت یہ ہے کہ خود ہمیں دولت مند بننے کے لیے دوسرے ملکوں کو غریب بنانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بہتر ہے کہ ہمارے گاہک غریب ہونے کے بجائے دولت مند ہوں۔ اسی طرح، طاقتور ہونے کے لیے، یہ ضروری نہیں کہ ہم دوسروں کو کمزور بنائیں۔ امن کے پھل سے دونوں کو فائدہ ہوتا ہے۔

امن کے لیے، اب اور تب، لڑنا پڑتا ہے۔ ملکیت اور لوگوں کا دفاع ضروری ہے۔ اور ضروری وسائل کو جمع کرنے کے لیے، ایک (محدود) حکومت کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن ایسی حکومتیں، جو اکثر بہت بڑی ہو جاتی ہیں، جنگجو بھی بن جاتی ہیں، شاید وہ اس طرح خوشحالی اور آزادی کے نہ ہونے پر پردہ ڈالنا چاہتی ہیں، یعنی یہ بتا کر کہ قوم کی سلامتی، قربانی، اتحاد اور فوجی طاقت کا تقاضا کرتی ہے۔ آزاد معاشروں کے لوگ بھی اپنے ملکوں کے ساتھ کوئی کم وفادار نہیں

ہوتے۔لیکن ان کی وفاداری ایک کھلے اور آزاد معاشرے اور اپنے خاندان، دوستوں، گاہکوں اور رضا کارانہ انجمنوں کے ساتھ ہوتی ہے، نہ کہ کسی آمر، یا پرچم، یا کسی قوم پسندانہ خواب کے ساتھ۔

کچھ لوگ خیال کرتے ہیں کہ امن کا راستہ کسی قسم کی عالمی حکومت کو قائم کرنا ہے، جو قوموں سے بلند ہو۔جبکہ بین الاقوامی فورم مفید ہوتے ہیں، جہاں اختلافات پر بات کی جا سکتی ہو اور ان خطرناک تنازعات کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہو، ہمیں یہ فرض نہیں کرنا چاہیے کہ جیسی ہماری قومی حکومتیں اس وقت ہیں، عالمی حکومت اس سے کوئی بہتر ہوگی۔ چونکہ عالمی حکومت بہت پھیلی ہوئی ہوگی، اور لوگوں سے اس کا فاصلہ بھی کہیں زیادہ ہوگا، اس کی طاقت بھی بہت ہی زیادہ ہوگی۔ نہ ہی کسی کے لیے بدسلوکی سے فرار حاصل کر کے دنیا کے کسی دوسرے حصے میں جانا ممکن ہو سکے گا۔ نہیں، امن کو فروغ دینے کا بہترین راستہ، حکومتی دائرہ کار کو کم کرنا ہے پھیلانا نہیں۔ اور انسانوں کے اس فطری رجحان پر انحصار کرنا ہے، یعنی پُرامن طریقے سے تعاون کرنا اور باہمی حالت کو بہتر بنانا۔

نواں باب
دلیل مختصر طور پر

آزادی کا مقدمہ

آزادی، خوشحالی کو جنم دیتی ہے۔ وہ معاشرے، جنھوں نے آزادی کو قبول کیا ہے، انھوں نے خود کو دولت مند بنا لیا ہے۔ جنھوں نے آزادی کو قبول نہیں کیا، وہ غریب کے غریب ہیں۔

لیکن ایک آزاد معاشرہ، غیر مادی طور پر بھی برتر ہوتا ہے۔ یہ افراد کے درمیان باہمی بھروسے اور تعاون کی بنیاد پر چلتا ہے، طاقت اور جبر کی بنیاد پر نہیں۔ اس کے شہری گہرے ثقافتی، ذاتی اور اخلاقی بندھنوں میں بندھے ہوتے ہیں۔ وہ طرزِ عمل کے بین الاشخاصی قاعدوں کو رضا کارانہ طور پر قبول کرتے ہیں، اپنے فائدے کی خاطر، اس لیے نہیں کہ یہ قاعدے ان پر ٹھونسے جاتے ہیں۔ ان کی حکومتیں، ان لوگوں کی مرضی سے چلتی ہیں، جن پر حکومت کی جاتی ہے۔ اور یہ قاعدے خود ان حکومتوں پر حکومت کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنے اختیار سے فائدہ نہ اٹھائیں۔

ایک آزاد معاشرہ، انسانی ذہانت، ایجاد اور جدت کاری کو پنپنے کی آزادی دیتا ہے۔ یہ اسے دولت تخلیق کرنے کے قابل بناتا ہے، جہاں پہلے کوئی دولت موجود نہیں ہوتی۔ ایک آزاد معاشرے میں، لوگ دوسروں کے استحصال سے دولت مند نہیں بنتے، جیسا کہ کم آزاد ملکوں کی اشرافیہ کرتی ہے۔ وہ دوسروں کو غریب تر بنا کر دولت مند نہیں بن سکتے۔ وہ صرف دوسروں کو مہیا کر کے دولت مند بن سکتے ہیں، یعنی وہ چیزیں مہیا کر کے، جنھیں وہ چاہتے ہیں، اور وہ دوسرے لوگوں

کی زندگیاں بہتر بنا کر دولت مند بن سکتے ہیں۔

محدود حکومت

بیشتر لوگ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ حکومت ایسے مقاصد کے لیے چاہیے جیسے کہ انصاف کی فراہمی اور ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کرنا، جن کے بارے میں افراد اکیلے فیصلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن قریب قریب ہر کوئی اس بات کو مانتا ہے کہ حکومت کا اختیار لازماً محدود ہونا چاہیے۔ ایک آزاد معاشرے کی حکومت ہوتی ہی اس لیے ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو نقصان نہ پہنچنے دے۔ یہ انصاف کا انتظام کرتی ہے اور اس کا نفاذ کرتی ہے، یعنی ان فطری قاعدوں کے ذریعے، جو انسانوں کو پُرامن طریقے سے مل جل کر تعاون کرنے کے قابل بناتے ہیں۔

ایک آزاد معاشرے کی حکومت، قانون کی حاکمیت کی پابند ہوتی ہے۔ اس کے قوانین کا اطلاق ہر کسی پر یکساں ہوتا ہے۔ اس کے لیڈر خود اپنے فائدے کے لیے شہریوں کو لوٹ نہیں سکتے، اپنے دوستوں کو نواز نہیں سکتے، یا اپنے اختیار کو اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال نہیں کر سکتے۔ ان کے اختیارات اور عہدے کا عرصہ دونوں محدود ہوتے ہیں، تا کہ کرپشن کو کم کیا جا سکے، جو حکومتی اختیار کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ آزاد اور کھلے انتخابات، اظہارِ رائے کی آزادی، نمائندے کتنی مرتبہ نمائندے بن سکتے ہیں، اور آئینی قاعدے، یہ سب جمہوری ادارے سیاسی لیڈروں کے اختیارات پر پابندیاں لگاتے ہیں۔

زیادہ برابری

ایک آزاد معاشرے کی معاشی کارکردگی سے، جو لوگ سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ غریب ہوتے ہیں۔ آزاد معاشرے، غیر آزاد معاشروں کی نسبت، معاشی طور پر زیادہ برابر ہوتے ہیں۔ زیادہ آزاد معاشروں کے غریب ان تعیّشات سے لطف اندوز ہوتے ہیں، چند برس قبل جن کا خواب بھی دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ وہ تعیّشات ہوتی ہیں، جو غیر آزاد معاشروں میں صرف حکمران اشرافیہ کو دستیاب ہوتی ہیں۔

ایک آزاد معاشرہ، مادی برابری کو ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ تسلیم کرتا ہے کہ دولت یا آمدنی کو برابر کرنے کی کوشش کا نتیجہ الٹا نکلتا ہے۔ یہ اپنی بہتری، سخت محنت اور مہم جوئی کی ترغیبوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ یہ سرمایہ تعمیر کرنے سے متعلق لوگوں کی حوصلہ شکنی کرتا ہے، جو پورے معاشرے کی پیداواریت کو بڑھاتی ہے۔ یہ افراد کو نئی دولت اور نئی قدر تخلیق کرنے سے روکتا ہے۔

لیکن آزاد معاشرے اور بہت سی اہم برابریوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں، جو غیر آزاد معاشروں میں اکثر موجود نہیں ہوتیں۔ لوگوں کی اخلاقی برابری کو تسلیم کیا جاتا ہے: ہر انسان کی زندگی کو قابلِ قدر اور حفاظت کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ قانون کے سامنے برابری موجود ہوتی ہے: فیصلے، مقدموں کے حقائق پر مبنی ہوتے ہیں، نہ کہ اس بات پر کہ آپ کون ہیں۔ شہریوں میں سیاسی برابری موجود ہوتی ہے: ان سب کو ووٹ ڈالنے، انتخابات میں کھڑے ہونے، اور اپنے سیاسی نظریات کے اظہار کا حق ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ حکام ان سے کتنا ہی پریشان کیوں نہ ہوں۔ اور انھیں مواقع کی برابری حاصل ہوتی ہے: لوگ کام یا تعلیم میں کسی امتیاز کا سامنا نہیں کرتے، اور اپنی نسل، مذہب، قومیت یا کسی اور خصوصیت کے باوجود اپنی بہتری کی کوشش کر سکتے ہیں۔

ایک آزاد معیشت

ایک آزاد معیشت لوگوں کو معاشی انتخاب کی آزادی دیتی ہے، جیسے وہ انھیں اپنے سماجی اور ذاتی انتخاب کی آزادی دیتی ہے۔ ایک آزاد معاشرے کے لوگ رضا کارانہ تبادلے کے ذریعے قدر تخلیق کرتے ہیں۔ آزادانہ تبادلہ دونوں کو بہتر بناتا ہے؛ اگر ایسا نہ ہو تو وہ یہ تبادلہ نہیں کریں گے۔

افراد دوسرے لوگوں کے ساتھ تعاون سے اور انھیں وہ اشیا مہیا کر کے خوشحال بنتے ہیں، جو وہ چاہتے ہیں، اور یوں انھیں صلے میں وہ چیز ملتی ہے، جو وہ چاہتے ہیں۔ فائدے کا امکان کاروباریوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ یہ جانیں کہ لوگ کیا چاہتے ہیں اور یوں وہ وہی چیز مہیا

کرتے ہیں۔ قیمتیں چیزوں کی کمی یا زیادتی کے بارے میں معلومات مہیا کرتی ہیں، اور ہر ایک کو بتاتی ہیں کہ کیا چیز بنائی جائے اور کیا چیز محفوظ کی جائے۔ اس طرح، وقت، مہارت، کوشش، سرمایہ اور دوسرے وسائل خود بخود اس طرف جاتے ہیں، جہاں ان کی فوری طلب ہوتی ہے اور جہاں ان کا استعمال کم اہم ہوتا ہے، اس طرف نہیں جاتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کو لوگوں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ کیا کیا جائے۔

ایک آزاد معیشت کو چلنے کے لیے قاعدوں کے ایک ایسے ڈھانچے کی ضرورت ہوتی ہے، جسے لوگ قبول کرتے ہوں، یعنی اس بارے میں کہ لوگوں کو اکٹھے کس طرح تعاون کرنا چاہیے۔ ان میں ملکیت اور ملکیت کے انتقال کے قاعدے شامل ہیں، اور معاہدے کے قاعدے بھی، جن کے تحت معاہدوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ اگر لوگوں نے کاروبار شروع کرنا وراشیا کا تبادلہ کرنا ہے، تو نجی ملکیت ضروری ہے۔ لیکن یہ دوسری آزادیوں کے احترام کے لیے بھی ضروری ہے۔ اگر سب کچھ حکام کی ملکیت میں ہو، تو سیاسی اقدام اور کھلی بحث ناممکن ہو جاتی ہے۔

انصاف اور قانون کی حکومت

انصاف کوئی ایسی چیز نہیں جسے قانون ساز طے کرتے ہوں۔ انصاف کے قاعدے، انسانی فطرت کا حصہ ہیں، یعنی ہمارا جاندار حصہ، جو افراد کے درمیان پُرامن تعاون کو بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔

ایک آزاد معاشرے میں انسان ہونے کی وجہ سے یہ فطری انصاف لوگوں کا حق ہوتا ہے۔ فطری انصاف کا تقاضا ہے کہ قوانین واضح اور یقینی ہوں، یہ کہ وہ لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہوں، یہ کہ وہ ان سے ناممکن چیزوں کا تقاضا نہ کرتے ہوں، یہ کہ وہ ماضی سے قابلِ نفاذ نہ ہوں، اور یہ کہ سزائیں قابلِ پیش بین ہوں اور جرم سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ہر مقدمے میں قانون کے ضروری تقاضے پورے کیے جائیں، منصفانہ قانونی چارہ جوئی ہو، اور مقدمہ چلائے بغیر طویل عرصے تک قید میں نہ ڈالا جائے۔ جن لوگوں پر جرم کا الزام لگے، انھیں اس وقت تک

معصوم سمجھ کر سلوک کیا جائے، جب تک وہ مجرم ثابت نہ ہو جائیں، اور یہ کہ بار بار ایک ہی جرم میں مقدمہ چلا کر افراد کو ہراساں نہ کیا جائے۔ ان اصولوں کو قریب قریب ہر کوئی قبول کرتا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ کس ملک، ثقافت، نسل یا مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس فطری انصاف کی ضمانت دینے اور قانون کی حاکمیت کو قائم کرنے کے لیے ایک مناسب طور پر آزاد عدلیہ ضروری ہے، جو سیاسی لیڈروں کے اثر ورسوخ میں نہ آ سکے۔ اسی طرح، پولیس کو بھی آزاد ہونا چاہیے۔ اگر آزادی کو قائم رکھنا ہے، تو پولیس اور عدلیہ میں کرپشن کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

آزادی کی دنیا

آمرانہ حکومتوں کے لیے باقی دنیا سے اپنی حرکتوں کو چھپانا زیادہ مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ملک تجارت اور سیاحت کے لیے اپنی سرحدیں کھول رہے ہیں، اور یوں نئے خیالات پھیل رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگ معاشی اور سماجی آزادی کے فائدے دیکھ رہے ہیں اور ان کا تقاضا کر رہے ہیں۔

اخلاقیات اور ایک آزاد معاشرے کے اداروں کو ان جگہوں پر تخلیق کرنا مشکل کام ہے، جہاں یہ پہلے سے موجود نہیں۔ انھیں پورے کا پورا مسلط کرنے کے بجائے، چھوٹی سی سطح سے شروع کرنا بہتر ہے، یعنی ایسے حالات پیدا کیے جائیں، جو لوگوں کو آزادانہ طور پر عمل کرنے اور اپنے اعمال کے ذریعے ایک آزاد معاشرہ تخلیق کرنے کی اجازت دیں۔ اس کا ایک نہایت بنیادی حصہ ملکیتی حقوق کا قیام ہے، تاکہ لوگ کاروبار اور تجارت شروع کر سکیں، اس اعتماد کے ساتھ کہ ان کی ملکیت کو ضبط نہیں کیا جائے گا۔

اصلاحات کے نتیجے میں حقیقی معاشی آزادی ملنی چاہیے، ایسی سرمایہ داری نہیں، جو حواریوں کو فائدہ دے۔ بہت سی حکومتیں، جنھوں نے ریاستی صنعتوں کی نجکاری کا دعویٰ کیا ہے، اصل میں انھوں نے ان کی ملکیت کو اپنے دوستوں اور عزیزوں کو منتقل کیا ہے۔ معاشی اصلاح کے

عمل میں ساری آبادی کو شامل کرنے ضرورت ہوتی ہے، تاکہ حقیقی تبدیلی آ سکے۔

ملک اگر اپنی سرحدوں کو بین الاقوامی تجارت کے لیے کھولتے ہیں، تو انھیں نقصان نہیں ہوتا۔ ملکی پیداکاروں کو مقابلے کے خلاف تحفظ دینے کا مطلب ملکی صارفوں کے لیے اونچی قیمتیں اور کم تر معیار ہے۔ جب مقامی کاروباری، بین الاقوامی تاجر کمیونیٹی کا حصہ بنتے ہیں، تو انھیں نئی مارکیٹیں اور نئے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ گذشتہ تین دہائیوں میں تجارت کے کھلنے اور پھیلنے کی وجہ سے ایک ارب سے زیادہ لوگوں کو بدترین غربت سے نجات ملی ہے۔ آزادی، انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ فائدہ مند اور پیداواری قوتوں میں سے ایک قوت ہے۔

منتخب کتابیات

Ashford, N. (2003), *Principles for a Free Society,* Stockholm: Jarl Hjalmarson Foundation. Thorough, short exposition of the principles on which a free society and free economy are built.

Bastiat, F. (2001 [1850]), *Bastiat's 'The Law',* London: Institute of Economic Affairs. Classic statement of liberal ideas from the French politician and political thinker.

Benn, E. (1964), *Why Freedom Works,* London: Sir Ernest Benn Ltd. Dated but enlightening defence of free markets by a leading UK businessman.

Butler, E. (2009), *The Best Book on the Market: How to Stop Worrying and Love the Free Economy,* Oxford: Capstone Books. Simple outline of how markets and trade really work.

Butler, E. (2012), *Public Choice – a Primer,* London: Institute of Economic Affairs. Simple explanation of government failure and the problems of self-interest in democratic systems.

Butler, E. (2012), *Friedrich Hayek: The Ideas and Influence of the Libertarian Economist,* Petersfield: Harriman House. Easy introduction to the liberal political scientist who developed much of the modern thinking on the spontaneous society.

Friedman, M. with R. Friedman (1962), *Capitalism and Freedom,* Chicago, IL: University of Chicago Press. Classic outline of the case for a free society and free economy by the US Nobel laureate in Economics.

Friedman, M. and R. Friedman (1980), *Free to Choose,* New York: Harcourt Brace Jovanovich. Engaging case for the free society, based on the television series of the same name.

Hayek, F. A. (1944), *The Road to Serfdom,* London: Routledge. Classic wartime exposition of the dangers of central planning and unrestrained governments.

Hayek, F. A. (1960), *The Constitution of Liberty,* London: Routledge. Large book tracing the origins of liberal ideas and the principles on which a free society must be founded.

Meadowcroft, J. (ed.) (2008), *Prohibitions,* London: Institute of Economic Affairs. Powerful set of arguments against government controls on many different lifestyle choices.

Mill, J. S. (1859), *On Liberty,* in J. S. Mill (2008), *On Liberty and Other Essays,* Oxford: Oxford University Press. On Liberty is a classic text on the case for freedom, the no-harm principle, limited government, natural justice and tolerance.

Norberg, J. (2003), *In Defense of Global Capitalism,* Washington, DC: Cato Institute. An instructive survey of the benefits delivered, to the poor in particular, by international capitalism.

Palmer, T. G. (ed.) (2011), *The Morality of Capitalism,* Arlington, VA: Students for Liberty and Atlas Foundation. Interesting collection of essays on morality, cooperation, equality, progress, globalisation and culture.

Pirie, M. (2008), *Freedom 101,* London: Adam Smith Institute. One hundred and one arguments against the free economy, knocked down in a page each.

Wellings, R. (ed.) (2009), *A Beginner's Guide to Liberty,* London: Adam Smith Research Trust. Straightforward explanations of markets, property rights, liberty, government failure, prohibitions and welfare without the state.

تبصرہ

علی سلیمان، ایگزیکٹو ڈائریکٹر
پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف مارکیٹ اکانومی، اسلام آباد، پاکستان

معاشی اور سیاسی بحرانوں کی وجہ سے اکثر آزادیوں پر حملے ہوتے ہیں۔ شدید معاشی ڈپریشن کے دوران تمام بڑی معیشتوں نے محصولات بڑھا کر تجارت کو محدود کردیا۔ اس ردعمل نے جغرافیائی اور سیاسی تناؤ کو بڑھاوا دیا اور معاشی مشکلات میں مزید اضافہ کیا۔ بنیاد پرست سوشلسٹ حکومتوں کے ظہور نے آدھی دنیا میں شہری، سیاسی اور معاشی آزادیوں پر قدغن لگا دیئے۔ ابھی حال ہی میں، نائن الیون کے واقعات اور اسکے تناظر میں امریکی ردعمل نے ایسی پالیسیاں مرتب کیں جس سے سیکیورٹی بڑھانے کی کوشش میں آزادی قربان ہوگئیں۔ اسی طرح، عالمی مالیاتی بحران جو سن 2008 میں شروع ہوا تھا، اور جس نے امریکی معیشیت کو بھی متاثر کیا اور اس سے کنٹرول، ضوابط اور تحفظات میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا۔ آزاد بازاروں کے تخلیقی تباہی کے اصول پر بھروسہ کرنے کے بجائے، بحراوقیانوس کے دونوں اطراف کی حکومتوں نے ناکام کاروباری اداروں کو ضمانت دینے کے لئے ٹیکس دہندگان کی بہت بڑی رقم استعمال کی ہے۔ ایسے ہی آزادی کو بہت خطرات ہیں۔ ایک چوتھائی صدی قبل، دنیا نے سوویت یونین میں ' گلاسنوسٹ' کو قبول کیا اور پھر برلن کی دیوار کے گرنے کا جشن بھی منایا۔ لیکن اب یورپ میں نوقوم پرستی اور مشرق وسطی میں بنیاد پرستی کی شکل میں نئے چیلنج سامنے آئے ہیں۔ اگر انہیں روکا نہ گیا تو دونوں رجحانات آزادی پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ اگرچہ قدرے سیاسی آزادی اور جمہوریت کے یورپ قومیت پسندی اور نسل پرستی کے پستی کی طرف لوٹ رہا ہے۔ مشرق وسطی میں، مذہبی بنیاد پرستی کا عروج قطعاً حیرت انگیز

نہیں جبکہ مارکیٹ اور جمہوریت کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں۔اس کے باوجود اکیسویں صدی میں افراد پچھلی صدی میں اپنے پیش رو سے کہیں زیادہ آزاد ہیں۔ انفارمیشن اور مواصلات ٹیکنالوجی انقلاب نے ہر طرح کی رکاوٹیں مٹا دیں۔ مثال کے طور پر چین میں، لی چینگنگ ایک نامور مصنف اور سماجی نقاد ہیں: ان کے سینا ویبو بلاگ پر قریباً ساٹھ لاکھ فالورز ہیں۔عرب بہار کے دوران، سوشل میڈیا نے بڑے پیمانے پر سیاسی اور سماجی آگاہی پھیلانے میں مدد کی۔ اگر معلومات طاقت ہے، تو انفارمیشن ٹکنالوجی نے فرد کو بااختیار بنا دیا ہے۔ اگرچہ جغرافیائی حدود باقی ہیں، لیکن وہ تیزی سے غیر متعلق ہو رہے ہیں۔ اس تناظر میں، ایمن بٹلر کے مونوگراف کی اشاعت ایک معاشرے کی بنیادی آزادی پر جدید پرائمر کے مجموعہ میں ایک خوش آئند اضافہ ہے۔ بٹلر کی کمال مہارت اس کی سادہ زبان میں پیچیدہ اور انتہائی بااثر خیالات کا اظہار کرنے کی صلاحیت ہے۔ وہ انتہائی کامیابی سے ناقدین اور مخالفین کے دلائل کو حقیقی مثالوں سے زیر کر دیتا ہے جو ان کے نظریاتی دلائل کی عکاسی اور تائید کرتی ہے۔ یہ کاوش ان لوگوں کیلئے ایک عمدہ تعارف ہوگی جو کہ ایک ذمہ دار اور آزاد معاشرے کے اصولوں کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر ان ممالک میں آزادی کو فروغ دینے والوں کے لئے مفید ثابت ہوگا جہاں ان اصولوں سے لوگ بیخبر ہیں اور جہاں روایتی آزادیاں نشانے پر ہیں۔

ادارے کا تعارف

الٹرنیٹ سلوشنز انسٹی ٹیوٹ ایک رجسٹرڈ، تعلیمی، تحقیقی، غیر جانبدار اور غیر سیاسی تھنک ٹینک ہے۔ جو ''افراد کے ہاتھوں، افراد کی فلاح'' کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔ ادارے کا مشن پاکستان میں قانونی کی حکمرانی و بالادستی، ایک مؤثر اور مختصر اور آئینی طور پر ذمہ دار حکومت کے تصور کا فروغ ہے۔ جو بلا امتیاز ہر شہری کی جان و مال اور بنیادی حقوق کے تحفظ کو یقینی بناتی ہے۔

انسٹی ٹیوٹ معاشی آزادی، اختیار پسندی کے سیاسی فلسفے، محدود حکومت، قانون کی حکمرانی، ملکیتی حقوق کے تحفظ، مارکیٹ ایکانومی، بنیادی حقوق اور انفرادی سبقت کی اقدار سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ مزید ادارہ ملک کے اندر نجی کاروبار کے فروغ اور عام شہریوں کیلئے بہتر کاروباری ماحول بنانے کے لئے کوشاں ہے۔ انسٹی ٹیوٹ ان اقدار کی روشنی میں مقامی تناظر کے تحت بالخصوص معیشت، قانون، تعلیم، صحت اور ماحولیات سے متعلق مسائل کے حل کی تلاش اور اُن پر عمل درآمد کیلئے کام کرتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں میں متون کا اُردو اور علاقائی زبانوں میں ترجمہ اور اشاعت، منتخب مسائل اور اُن کے حل سے متعلق تحقیق پر مبنی مواد کی تیاری اور اشاعت اور دلچسپی رکھنے والے طلبہ، اساتذہ اور صحافیوں کیلئے لیکچرز، ورکشاپس، سیمینارز، رہائشی کورس، کانفرنس وغیرہ کا انعقاد شامل ہے۔

امریکہ کے یونیورسٹی آف پنسلوانیا نے اپنے سالانہ شائع ہونے والے گلوبل گوٹو تھنک ٹینک ۲۰۱۹ء رپورٹ میں الٹرنیٹ سلوشنز انسٹی ٹیوٹ پاکستان کو دنیا بھر کے مؤثر ترین پبلک پالیسی کے بااثر اداروں میں ۵۶ ویں نمبر پر رکھا ہے اور ساؤتھ ایسٹ ایشیاء اور پیسفک ریجن میں ۲۶ واں بہترین تھنک ٹینک قرار دیا ہے۔

ادارے کی مطبوعات

۱۔ The State of the rule of Law in Pakistan 2019 Annual Report (انگریزی) از ڈاکٹر خلیل احمد اور ڈاکٹر رضاء اللہ

۲۔ پاکستان میں ریاستی اشرافیہ کا عروج (اُردو) از ڈاکٹر خلیل احمد

۳۔ چارٹر آف لیبرٹی (انگریزی) از ڈاکٹر خلیل احمد

۴۔ پاکستانی کشاکش تحلیل و تعدیل اور آگے بڑھنے کا راستہ (اُردو) از ڈاکٹر خلیل احمد

۵۔ سیاسی پارٹیاں یا سیاسی بندوبست (اُردو) از ڈاکٹر خلیل احمد

۶۔ Economic calculation in the socialist society (انگریزی) ٹرا گیو جے بی ہاف

۷۔ The adventure of Johnathan Gullible a free market Odyssey (سندھی ترجمہ) از کین سکول لینڈ

۸۔ عوامی فلاحی ریاست کی کہانی بیچارے جوتھن کی زبانی (اُردو ترجمہ) از کین سکول لینڈ

۹۔ Liberate to learn: Education vouchers scheme in Lahore - Pakistan (انگریزی) از علی سلمان

۱۰۔ Economic freedom of the world: 2008 Annual Report Pakistan Edition (انگریزی) ادارہ

۱۱۔ The greatest battle for the rule of law in Pakistan (انگریزی) از ڈاکٹر خلیل احمد

۱۲۔ Well being and freedom: An empirical enquiry into development (انگریزی) از علی سلمان

۱۳۔ Pakistan democratic impasse: Analysis and the way forward (انگریزی) از ڈاکٹر خلیل احمد

۱۴۔ How to end all wars (انگریزی) از اسلم آفندی

۱۵۔ Hard facts of history (انگریزی) از اسلم آفندی

ALTERNATE SOLUTIONS INSTITUTE

ISBN 978-969-8777-15-9

Alternate Solutions Institute Pakistan
Website: asinstitute.org | Email: info@asinstitute.org